تشریحِ رازِ معرفت

معروف بہ

جواہرات اسلام

چمپت رائے جین

مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی

قیمت آٹھ آنہ

تشریحِ اسرارِ معرفت

المعروف بہ

جواہراتِ اسلام

مؤلفہ

جین درشن دواکر ودیا واردھی مسٹر چمپت رائے صاحب جین

بیرسٹر ایٹ لا۔ دہلی

سنہ ۱۹۳۰ء

باراول

دِلّی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا

تشریحِ رازِ معرفت

المعروف بہ

جواہرات اسلام

دیباچہ

دینِ اسلام کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں غیر مسلم ناظرین کو اس میں سوائے بیہودگی اور بدتمیزی کی یاوہ گوئی کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے۔ ماہرانِ علومِ سائنس اسکے کلیتاً خلاف ہیں۔ وہ کسی قادرِ مطلق صانعِ دنیا کو نہیں مانتے ہیں۔ خود مسلمان ہی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور کئی فرقوں میں منقسم ہیں جن میں آپس میں خونریزیاں ہوئی ہیں رندوں اور زاہدوں کے اختلافات قدیم سے قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں۔ شاید یہ تو ہندوؤں کے گیانی اور کریا کانڈیوں کے مکالمے کی ہی مثال ہیں۔ پس یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اصلیت حال کا پتہ لگایا جاوے

فہرست مضامین رسالہ معرفت معروف بہ جواہرات اسلام

مضمون	صفحہ
فہرست ہذا	۲
دیباچہ	۳
باب اول افشائے راز	۵
باب دوم۔ مدعائے دین	۹
باب سوم حیات ابدی	۱۱
باب چہارم۔ علم کُل	۱۴
باب پنجم سرو رجاودانی	۲۲
باب ششم۔ روح پاک	۲۸
باب ہفتم۔ تن خاکی	۴۰
باب ہشتم۔ نفس امّارہ	۴۴
باب نہم۔ ریاضت	۵۲
باب دہم۔ خالق۔	۷۷
باب یازدہم۔ تناسخ ارواح	۹۲
باب دوازدہم۔ قربانی گاؤ۔	۹۸
تمت۔ ترجمہ فارسی اشعار۔	۱۱۰

افشائی راز

باب اوّل

(۱)

اگر تن را نباشد دل منور زیر خاکش کن
نباشد در شبستان عزت فانوس خالی را

بانی اسلام نے کہا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے اپنی روح کو جان لیا اُس نے خدا کو جان لیا۔ یعنی روح و خدا ہم ذات وہم جنس ہیں۔ لیکن روح کو جان لینا کوئی آسان بات نہیں ہے بہت کم مسلمان ہیں جنہوں نے اس امر کی کوشش بھی کی ہو کہ وہ اپنی روح و ہستی کی واقفیت پیدا کریں روح کیا چیز ہے؟ آیا وہ کوئی شے باوجود ہے یا بلا وجود۔ یونہی ایک لفظ ہے۔ فانی ہے یا امر ہے۔ کون کون صفات اسکی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور کون ایسی ہیں جو باہر سے شامل ہوگئی ہیں؟ اِنکا جواب تو بڑے بڑے فلاسفر تک دینے سے قاصر رہے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ بغیر حصول علم حقانی (یعنی معرفت) اِن کا جواب نہیں بن سکتا۔ اِسی لئے شیخ سعدی فرما گئے ہیں کہ "بے علم نتواں خدا را شناخت"

علم معرفت ایک باقاعدہ دفتر ہے۔ لیکن اسکو بہت ہی کم اشخاص سمجھے

اور اسکے قیمتی جواہرات کو ناقص پتھروں - اور چمکدار شیشے کے ٹکڑوں سے علیحدہ کرکے اُس کے حسن تجلی کو بنی نوع انسان کے سامنے رکھا جاوے جس سے مسلم اور غیر مسلم سب کا فائدہ متصور ہے -

ذیل کے صفحات میں اسی بات کو دھیان میں رکھکر معقولیت کے طرز سے یعنی سائنس کے طور پر اسلامی فلسفہ کا موازنہ کیا گیا ہے - نتیجہ خود ہی اس بات کو ظاہر کردیگا کہ ان اوراق کا ٹائیٹل یعنے عنوان کہانتک مناسب اور موزوں ہے ؀

جین بورڈنگ
تاردیو - بمبئی

چمپت رائے جین
۱۹ فروری ۱۹۳۰ء

اختلاف بھی کوئی معمولی اختلاف نہ تھا۔ اُن میں سے ایک اگر پورب کو جاتا تو دوسرا پچھم کو رُخ کئے ہوئے چلتا تھا۔ مگر رندوں کی جماعت قلیل تھی۔ اِس لئے اُن کی نہیں چلتی تھی۔ عارف لوگ اپنے تئیں عوام پر ظاہر بھی اسی لئے نہیں کرتے تھے۔ چھپے چھپائے پڑے رہتے تھے اور چھپ چھپ کر ہی اپنے عقائد کو عمل میں لاتے تھے۔ اگر کسی نے اُن سے کوئی سوال کیا۔ تو حسب لیاقت سوال کرنے والے کے اس کا جواب دیا۔ سمجھدار معتبر شخص کو صرف اسقدر بتاتے تھے جس سے اگر وہ خود بچار کرے تو عقدہ وا ہو سکے۔ جاہل۔ خودغرض۔ جنونی۔ ناواقف کو اُڑان گھائی کی قسم کا جواب دیدیتے تھے۔ جس سے اُسکو اصلیتِ حال کا پتہ نہ چلے اور وہ جواب دینے والے کو پاگل ہی سمجھ کر چپکا ہو رہے۔

لیکن ایک بات وہ صاف صاف کہدیا کرتے تھے اور وہ یہ تھی کہ بغیر پیر کی مدد کے مذہب کا سمجھنا ناممکن ہے۔ پیر ہی جب جستجو کرنے والے کی مدد کرے تو اُسکی مشکل آسان ہو ورنہ نہیں۔ مولنٰا روم فرماتے ہیں کہ ؎

تو بصورت رفتۂ اے بے خبر[1]	زاں ز شاخ معنی بے بار و بر
تو بصورت رفتۂ گم گشتۂ[2]	زاں نمی یابی کہ معنی ہشتۂ
درگذر از نام و بنگر در صفات[3]	تا صفات رہ نماید سوئے ذات

[1] اے بے خبر شخص تو صورت کا عاشق بن بیٹھا ہے اسلئے تجھے معنی یعنی اصلیت کا لطف نہیں ملا۔
[2] تو صورت کو ہی اصلیت سمجھ کر گم ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے اصلیت حال تجھ کو معلوم نہیں۔
[3] نام کو چھوڑ کے صفات کی تلاش کر تا کہ صفات سے تجھے ذات کا پتہ لگے۔

ہیں۔ زیادہ تر لوگ تو فلسفہ معرفت کو اُلٹا ہی سمجھ پائے ہیں۔ اور اسی وجہ سے
عارفانِ حق شناس اُنکے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے اور چُھپا چھپا
کے اپنے عقائد کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

عاقل آرد معرفت را در نہاں — جاہل آرد معرفت را برزباں

(یعنی) معرفت کو رکھے عاقل تو نہاں — اور جاہل اُسکو لائے برزباں

جماعتِ درویشانِ باکمال نے اِسی باعث یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ جب تک
خوب پورے طور سے مرید یعنی علم کے طالب کا امتحان نہیں کر لیتے تھے اُسکو
رموز معرفت نہیں سکھاتے تھے۔ لوگ برسوں اُنکے پیچھے پھرا کرتے تھے لیکن وہ
کبھی التفات تک نہیں کرتے تھے۔ ہاں جب اُنکو یہ بات یقینی طور سے معلوم ہو جاتی
تھی کہ کوئی خاص شخص واقعی نیک دِل اور نیک صفات رکھتا ہے اور اُس
سے اِس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ وہ رموز خفیہ سے بھڑکے یا جماعتِ عارفان
کو ایذا پہنچائے تب وہ اُسکو شوق سے شاگردی میں قبول کرتے تھے۔ اور اُسکو
اپنے مثل بنانا چاہتے تھے ۔

فی الحقیقت معرفت میں ایسے ایسے اسرار بھرے ہوئے ہیں جن کے سُننے
کی تاب عوام نہیں رکھتے تھے اور جنکو سنکر وہ کہنے والے اور اُسکے ساتھیوں تک کو
کافر قرار دیکر مار ڈالتے تھے ۔

رندوں اور زاہدوں کے اختلاف کا حال آگے چلکر کہا جاویگا۔ لیکن یہ

باب دوم

(مدعائے دین)

مذہب سرور جاودانی کے حصول کا رستہ ہے[1]۔ لفظی معنی بھی اس کے رستہ کے ہیں۔ یہ وہ رستہ ہے جس پر چلکر انسان ضعیف البنیان حیاتِ جاودانی۔ علم کلّ اور سرورِ روحانی کو جو لازوال ہے حاصل کرلیتا ہے۔

راہ حصول قاعدہ قرینہ سے طے ہوسکتی ہے۔ بغیر پیر کی مدد کے گمراہ ہوجانے کا سخت اندیشہ ہے۔ ٹھیک واقفیت کی بڑی ضرورت ہے۔

اگر انسان کو فی الواقع حیاتِ ابدی۔ علمِ کلّ۔ اور سرورِ لازوال حاصل ہوجاویں تو پھر کسی چیز کی ضرورت نہ رہے۔ انکے باہر اور کوئی چیز لینے قابل نہیں ہے۔ اور نہ ہوسکتی ہے۔ مگر یہ چیزیں کسی دوکان یا بازار میں نہیں بکتی ہیں۔ اور نہ ہمارے باہر ہی سے ہم کو مل سکتی ہیں۔ کیونکہ باہر سے تو جو کچھ دستیاب ہوگا وہ سب حواسِ خمسہ کے ذریعے سے ہی ہمارے حظ کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیکن حواسِ خمسہ کو مجموعی طور پر گدھے کے نام سے عارفانِ حق شناس نے نامزد کیا ہے۔ مولنا روم فرماتے ہیں

شاہ خرِ نفس تو بر میخش بہ بند   چند بگریزد ز کار و بار چند

---

[1] براؤن صاحب نے بھی اپنی کتاب موسومہ درویشز DERVISHES کے صفحہ ۲۵ پر درویشوں کا قدیم اعتقاد انہیں الفاظ میں دیا ہے۔

پیرا بگزیں کہ بے پیر این سفر[۱] | ہست پرآفات و پر خوف وخطر
ہر کہ او بے مرشدے در راہ شد[۲] | او ز غولاں گمرہ و در چاہ شد
گردن خر گیر و سوئے راہ کش[۳] | سوئے رہباناں و رہ دانان خوش

راز درویشی کوئی نئی اختراع نہ تھی - خود حدیث میں پیغمبر صاحب نے اپنے کو مدینۃ العلم فرمایا ہے اور علی کو ہی اُس کا پھاٹک کہا ہے - مطلب یہ ہے کہ کلام بانی اسلام سمجھنے کے لئے علی کی تعبیر کی ضرورت پڑتی تھی - اسلام سے بھی قدیم تر جو مذاہب ہیں اُن میں بھی بہت کر کے خفیہ رموز ملتے ہیں - یہی باعث تھا کہ عوام بانیانِ مذاہب کی مخالفت کرتے تھے - کیونکہ رموز کے سمجھنے کی قابلیت نہ ہونے کے باعث وہ بہت جلد بھڑک اُٹھتے تھے - اور ہر شخص اُن سے خوف زدہ رہا کرتا تھا - بعض بزرگوں نے اپنی جان کا خیال نہیں کیا - مگر اپنے ساتھیوں کی ہستی کی تو حفاظت ضروری ہی تھی

---

[۱] پیر کو ڈھونڈ - کیونکہ بغیر پیر کے اس منزل میں آفت و خوف و خطرہ بہت ہے -

[۲] جس نے بغیر پیر کی مدد کے اس راہ میں قدم ڈالا وہ غولوں سے گمراہ ہو کر کنوئیں میں گر پڑا

[۳] اپنے گدھے (نفس) کی گردن پکڑ اور رستہ کی طرف لا - اور خوش دل و محافظ رستہ کے جاننے والوں کی مدد لے ؛
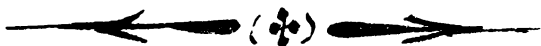
ہماری خواہش حیاتِ ابدی حاصل کرنے کی ہے۔ لیکن پہلے اسکے کہ ہم اِس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں ہمکو یہ تو جان لینا چاہیے کہ "حیاتِ ابدی کس شے کے لئے ممکن ہے اور کس حالت میں؟ اگر کسی نے ہم سے جھوٹا وعدہ کر دیا کہ ہم تم کو "حیاتِ ابدی" دیوینگے۔ تو ہم کیسے اسکو جان لیں کہ یہ شخص سچ کہتا ہے یا جھوٹ*

قدرت میں دو قسم کی اشیاء پائی جاتی ہیں۔ ایک مفرد اور دوسری مرکب۔ ان میں سے مرکب پائدار نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن مفرد ہمیشہ ہی رہتی ہیں۔ اُنکا ناش نہیں ہو سکتا ہے۔ جیسے چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ مادّہ کا۔ ناش ہو جانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ حصوں اور ٹکڑوں اور ذرّوں کا جن سے ملکر کوئی شے بنی ہو الگ الگ ہو جانا یعنی بکھر جانا۔ جس میں ٹکڑے۔ حصے یا ذرّوں کی ملاوٹ ہے ہی نہیں۔ اُس کا ناش نہیں ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُسکی ابتدا ہی ممکن ہے۔ درویشانِ سلف اِس راز سے بخوبی واقف تھے۔ اور اُنہوں نے اسکو اس طرح پر ظاہر کیا ہے کہ ذاتِ الٰہی مفرد ہستی* ہے۔

*۔ دیکھو "دی درویشیز" صفحہ ۶۱۔

یعنی اپنے نفس کے گدھے کو تو میخ سے باندھ دے۔ کب تک تو اُس کے کاموں کے لیئے دوڑتا پھرے گا۔ پھر بھی فرمایا ہے کہ

مار شہوت را بکش در ابتدا (۲) ورنہ اینک گشتہ مارت اژدہا

اگلی بیت میں اِسی نفس کو دوزخ خو کہا ہے۔

چُوں شما ایں نفس دوزخ خوئے را (۳) آتشی و گبر فتنہ جوئے را

اصلیت یہ ہے کہ انسان کو اپنی روح کے وجود کو سمجھنا چاہیئے۔ اگر وہ رازِ ہستی کے بڑے سے بڑے مسئلوں کو جاننا چاہتا ہے۔ اِسی لئے یہ کہا گیا ہے۔ کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ +

لازم آجاتا ہے یعنی ایک علم کی بجائے اِس صورت میں آٹھ علم ہونے چاہئیں۔ مگر یہ تجربہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ ہم کو ایسا جملہ سُننے سے ایک ہی گیان ہوتا ہے متعدد علم نہیں ہوتے اور نہ علم ٹکڑوں میں بٹ کر ضائع ہوجاتا ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوا کہ سمجھ مفرد شے ہے مُرکب نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر کسی شے کو ہم دیکھیں اور دیکھنے کے وقت اُسکی شبیہ ہماری سمجھ کے ٹکڑوں اور حصّوں میں بٹ جاوے تو بھی ہمکو اُس کا علم نہیں ہوگا۔ کیونکہ جہاں بھی منقسم شدہ جزو پھر فراہم نہیں ہوسکینگے۔ باقی اُمور مثل پہلی دلیل کے ہی متصور ہونگے۔ اِس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دیکھنے کی قوت میں کسی مرکب شے کی صفت نہیں ہوسکتی ہے بلکہ ایک مفرد شے کی ہی صفت ہے۔

یہی مفرد شے رُوح کہلاتی ہے۔ اسکی شان میں کہا گیا ہے کہ یہ جسم کے پہلے موجود تھی۔ دانشمندوں نے جسم مادّی کو اسی کا قیدخانہ قرار دیا ہے۔ درویشوں کا یہی اعتقاد رہا ہے کہ جس طرح ہوسکے اسکو جسم کی قید سے رہا کرنا چاہیئے۔ تاکہ یہ حیات ابدی کو جو فی الواقع اسکی صفت ہی ہے حاصل کرسکے۔ حکمائے عرب نے بھی روح کو المجردات میں شمار کیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ روح مفرد شے ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسی شے ہے کہ نہیں۔ جو ابدی یعنی مفرد کہی جاسکے۔ مادی ذرّے تو بہت سے ہمارے جسم میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تو محض بے جان ہیں۔ اِن سے ہمارا کام نہیں بن سکتا ہے۔ ہمکو تو کسی جاندار مفرد چیز کی ضرورت ہے۔ اِس لئے ایسی چیز کی ہی تلاش ہم کو اب کرنی چاہیئے ؎

جب ہم اپنی ہستی کی طرف توجہ کرتے ہیں تو فی الواقع ہماری ہستی خود ایک جاندار۔ اور مفرد شئے ملتی ہے ہستی سے مراد یہاں جسم سے نہیں ہے۔ بلکہ دیکھنے۔ سُننے۔ جاننے کی قوت جس شئے میں ہے اُس سے مُراد ہے۔ ہم یہاں پر صرف دو دلیلیں دینگے جو اِس بات کو ثابت کردینگی۔ کہ جس شئے کا کام جاننا ہے وہ شئے مفرد ہی ہوسکتی ہے مرکب نہیں

دلیل اول۔ اگر جاننے کی قوت ہماری مرکب ہوتی تو وہ حصّوں اور ٹکڑوں کا مجمُوعہ ہوتا۔ اب اگر ایک مرکب شئے کسی جملہ کا مطلب سمجھنا چاہے تو یہ ظاہر ہے کہ جملہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے سمجھنے والی قوت کے حصّوں پہ منقسم کرنے ہونگے۔ مثلاً فرض کرو کہ ذیل کا جُملہ کسی نے سُنا کہ بمبی ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ ہے۔ اب اِس جملہ میں آٹھ الفاظ ہیں۔ فرض کرو کہ ہماری سمجھ کے آٹھ ٹکڑے۔ اِن آٹھ لفظوں کو ایک ایک کرکے جان دلیں۔ تو کیا کل جملہ سمجھ میں آجائیگا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایسی صُورت میں تو صرف ایک ایک حصہ ایک ایک لفظ کو جانیگا۔ کوئی حصّہ بھی پورے جُملہ کو نہیں جانیگا۔ اور یہ ہوتا نہیں ہے۔ کہ حصّے اپنے اپنے لفظوں کو ایک دوسرے سے بدل لیتے ہوں۔ کیونکہ علم ایک ایسی شئے ہے جو ناقابلِ انتقال ہے۔ اور اگر یہ بھی مان لیا جاوے کہ سمجھ کے حصے ایک دوسرے کے دل کا حال جان بھی لیتے ہیں۔ تو ہر ایک حصہ کو آٹھوں لفظوں کا اِس طرح سے علم ہونا

اس سے ظاہر ہے تمام اشیار کا علم روح میں فطرتاً بنا بنایا موجود ہے۔ اور بات نہیں ہے کہ مادی اشیار کا عکس ہی روح میں پڑتا ہے اور وہی علم کہلاتا ہے۔ کیونکہ علم تو ایک قسم کا احساس ہے جو غیر مادی ہے اور عکس ایک مادی کرنوں کا مجموعہ ہے علم میں رنگ و بو و گرم پن و ٹھنڈا پن وغیرہ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ تو مادی اشیا میں ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو برف کا علم خود ٹھنڈا ہو جانا چاہیئے۔ اور اُبلتے ہوئے گرم پانی کا علم گرم ہونا چاہیئے۔ علم اور عکس اس لئے دو چیزیں ہیں۔ علم روحانیت کا جزو ہے۔ عکس مادیت کو لئے ہوئے ہے۔ باہری شے کا عکس کبھی علم نہیں بن سکتا۔ البتہ وہ علم کو جو روح کی ذات میں خفیہ ہے جگا سکتا ہے ❊

فی الحقیقت روح میں تمام علم موجود ہے مگر جسم کی قید کے باعث وہ اپنا اظہار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے جب باہر کی شے کی اشتعال اُسکو پہنچتی ہے تو وہ بھڑک کر نمودار ہوتا ہے ورنہ پس پردہ مادہ لاچاری کی سی حالت میں پڑا رہتا ہے ❊

اسی وجہ سے ابن خلدون نے کہا کہ بیجا اور حواس خمسہ کی موجودگی کے باعث روح اپنے خزانہ علمی سے محروم ہے اور اسی باعث سے نیند اور غشی اُس پر طاری ہوتے ہیں جب وہ کامل اور پاک حالت کو حاصل کر لیتی ہے تب بغیر جسمانی ذرایعہ یعنے بغیر مدد حواس خمسہ و من کے اُسکو حصول علم ہوتا ہے۔

اب یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ علم کا اظہار ہو یا نہ ہو مگر وہ غارت نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ہم کاغذ کے ایک ورق کو ہاتھ میں لیں تو اُس کاغذ کا علم ہم کو ہو جاتا ہے

باب چہارم

علم کل

ابن خلدون نے ٹھیک کہا ہے کہ روحانیت کے لحاظ سے روح کے دیکھنے کی قوت مطلق یعنی غیر مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روح سب اشیا کا علم حاصل کر سکتی ہے۔ ابن خلدون ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ذاتِ روحانیت میں جملہ اشیا کا علم موجود ہے اور روحانیت کا حصول مادی اجزا سے پورے طور سے علیحدہ ہو جانے اور جسمانی حواس کے معدوم ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

دراصل روح اور علم دو چیزیں نہیں ہیں۔ علم روح میں اس طرح نہیں رہتا ہے جیسے کوئی کرایہ دار مکان میں رہتا ہے۔ علم بنانے سے نہیں بنتا ہے اور توڑنے سے ٹوٹ نہیں سکتا ہے۔ باہری دنیا میں گلاب کا پھول مہینوں میں طیار ہوتا ہے۔ پہلے ایک قلم باغ میں لگائی جاتی ہے۔ پھر اسکی دھوپ چھاؤں سے حفاظت مہینوں کی جاتی ہے۔ تب اس میں ایک کلی نکلتی ہے۔ جو کچھ دنوں میں کھل کر پھول کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لیکن روحانی دنیا میں یہ کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے علم کے باغ میں سے روح ایک دم ویسا ہی پھول مہیا کر دیتی ہے جیسا تم اسکی آنکھ کے سامنے رکھو۔ وہاں نہ قلم لگائی جاتی ہے نہ کلی لگتی ہے اور نہ کوئی اور ہی کارروائی ہوتی ہے۔ اور اگر تم ایک پھول کی جگہ ایک ٹوکرا بھر کے پھول یا پھولوں کا باغ اسے دکھاؤ تو اسی وقت اپنے ذخیرہ علم سے ہو بہو ویسے ہی نمونے پیش کر دیتی ہے۔

دو لفظ ایک ہی شے کے لئے استعمال ہوتے ہیں - ہاں فرق اس بات کا ہوجاتا ہے کہ جسم کے مادی اثر کے باعث کسی روح میں علم کی افزونی کا اظہار ہوتا ہے - اور کسی میں کم کا - اگر سب ارواح قیدِ جسم سے رہائی پا جاویں تو سب یکساں مزاج اور فطرت کی ہونگی - جیسے سونا کہ اس میں کھوٹ کی آمیزش کے باعث تو فرق ہوجاتا ہے لیکن اگر کھوٹ اس میں سے نکال دیا جائے تو سونا سونا سب یکساں فطرت واوصاف کا ملتا ہے - اسی لئے ابن خلدون نے روحانیت کو مجموعی علمیت مانا ہے یہ بھی نہیں ہے کہ علم روح کے باہر سے آتا ہو - باہر کہیں علم کا ذخیرہ نہیں ہے کہ اس میں سے کوئی شخص وقتاً فوقتاً اٹھا اٹھا کر علم یا علمی اشکال ہمکو دیتا رہتا ہو علم تو احساسِ روحانیت ہی جو روح سے کسی طرح علیحدہ ہو ہی نہیں سکتا ہے - کیا ہم اپنا علم کسی دوسرے کو دے سکتے ہیں ؟ نہیں - ہرگز نہیں - ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اپنی بات چیت سے دوسرے شخص کے دل میں اپنے جیسے خیالات پیدا کر دیں - لیکن وہ علم جو اسکو حاصل ہوگا ہمارے علم کا حصہ نہیں ہے - خود اسکی روحانیت کی صفت ہے جو ہمارے ذریعہ سے بیدار ہوگئی ہے - نہ ہمارے علم میں اسکے حصولِ علم سے کچھ کمی کسی طرح کی واقع ہوئی ہے - اور نہ اسکے دل میں ہی کوئی چیز باہر سے آکر داخل ہوئی ہے - صرف کچھ خفیہ و خفتہ علمی اشکال و تخیلات جاگ اٹھے ہیں - جنکو وہ محسوس کر رہا ہے - ابن خلدون بلا مبالغہ سچ کہتا ہے جب وہ علمیت کو روحانیت یعنی صفتِ عاقل سے منسوب کرتا ہے ؛

یہ علم بھی ویسے ہی مسلم و مکمل ہے جیسے کہ خود کاغذ۔ لیکن اگر ہم اس کاغذ کے ورق کے دو ٹکڑے کر ڈالیں تو کیا ہمارے من میں جو علمی شکل اسکی تھی اُسکے بھی دو ٹکڑے ہوگئے ؟ مگر اس علمی شکل کو کون ہاتھ ایسے ہیں جو پھاڑ سکیں گے۔ اصلیت یہ ہے کہ ابتدائی علمی شکل کی بجائے ایک اور علمی شکل اب ظاہر ہوگئی ہے جو مثل اول شکل کے سب طرح سے مسلم اور مکمل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہمارے علم میں دو پھٹے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کی شکل ہے۔ پھٹا ہوا علم نہیں ہے۔ ٹوٹا ہوا خیال شکستہ علم کچی ہوئی علمی شکلیں سمجھ یا علم نہیں ہوسکتیں۔ جہالت نا سمجھی۔ بیوقوفی۔ ناہوشمندی ہی ہوسکتی ہیں۔ مگر پھٹے ہوئے کاغذ کا علم۔ بیوقوفی۔ ناہوشمندی۔ جہالت نہیں ہے بلکہ وہ بہ حیثیت علمیت کے ایسا ہی مکمل اور مسلم ہے جیسا ایک ثابت اور پورے کاغذ کے ورق کا علم۔ پس یہ ظاہر ہے کہ علم غارت نہیں ہوسکتا ہے۔

ہر ایک روح میں علم کل فطرتاً موجود ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ارواح خیالی بندش نہیں ہیں بلکہ ایسی شے ہیں جو قائم بالذات ہیں تو اُنکے اوصاف یکساں ہونے چاہئیں اسلئے جو بات ایک روح کو معلوم ہوسکتی ہے وہ اور سب روح کو بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ پس ہر ایک روح میں فطرتاً ماضی و حال اور مستقبل کی تمام ارواح کے متعلق ہر بات جاننے کی قابلیت موجود ہے اِس لئے کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ جس کے لئے یہ کہا جائے کہ اسکو ایک روح تو جان سکیگی مگر دوسری نہیں۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ علم روحانیت کے ساتھ نسبت رکھتا ہے۔ روح اور علم فی الحقیقت

نقشِ تن را نافت دار بام شست (۵) پیشِ چشم کل آت آت گشت

ہنگرم در غورہ می بینم عیاں (۶) ہنگرم در نیست شئے بینم عیاں

ہنگرم سر عالمے بینم نہاں (۷) آدم و حوا نرستہ از جہاں

از صد وشِ آسمان بے عمد (۸) آنچہ دانستہ بدم افزوں نشد

زانکہ نور انبیاء خورشید بود (۹) نور حسِ ما چراغ و شمع دود

زانکہ او ایں نور را بینا بود (۱۰) شرح او کے کار بو سینا بود

مگر یہ علم یا عقل کل ہماری موجودہ حالت میں منتشر ہو گیا ہے۔ مثنوی میں فرمایا ہے ؎

زر عقلت ریزہ است اے متہم (۱۱) بر قراضہ مہر سکہ چوں زنم

عقل تو قسمت شدہ بر صد مہم (۱۲) بر ہزاراں آرزوئے طم ورم

جان قسمت گشتہ در جو فلک (۱۳) درمیان شعت سودا مشترک

اس لئے ہدایت ہوتی ہے۔ کہ

جمع باید کرد اجزار العشق (۱۴) تا شوی خوش چوں سمرقند و دمشق

جو جو چوں جمع گردد ز اشتباہ (۱۵) پس تواں زد بر تو سکہ بادشاہ

ور ز مثقالے شوی افزوں تو خام (۱۶) از تو سازد شہ یکے زرینہ جام

پس برو ہم نام و ہم القاب شاہ (۱۷) یا شد و ہم صورتش ای وصل خواہ

یہ جام زریں خود نورِ روح ہی ہے جو نام القاب اور صورت میں خدا ہی ہے۔ اسکی ہمہ داتی کی صفت اس وقت تن خاکی و نفس امارہ کے باعث محدود و معین ہو گئی

اور یہ بھی نہیں ہو کہ یہ کوئی ایسی شے ہو کہ جسکو کبھی کوئی جان ہی نہیں پاویگا کیونکہ جسکو کبھی کوئی جان ہی نہیں پاویگا اُس کا وجود ماننے کے لئے کوئی وجہ ہمکو نہیں ملیگی - اور بلا وجہ کسی چیز کو کیسے مان لیا جاوے - اور اگر کوئی شخص ہم سے کہے "کہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی شے ایسی بھی ہے جس کو کوئی نہیں جان سکتا" تو وہ خود ہی اپنے دعوے کی تکذیب کر دے گا - کیونکہ وہ تو خود ہی اُس شے کے وجود سے واقف نہ ہوگا -

اس لئے جبکہ روح ایک مفرد شے ہے تو جو حالت اُسکی ایک مقام پر ہے وہ ہی حالت اُسکی تمام ہستی کی ہوگی - اور چونکہ علم یا رُوح شے ہے اِس لئے علم اور روح فی الواقعہ دونام ایک ہی شے کے قرار پاتے ہیں - علم روح سے علیٰحدہ نہیں ہے - جیسے لکڑی میں چنگاری چھپی رہتی ہے - اِسی طرح سے رُوح میں علم غیر نمایاں ہے - جیسے لکڑی اور چنگاری الگ الگ نہیں ہیں - اور نہ ہو سکتے ہیں - ایسے ہی روح اور علم الگ الگ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں - اور جیسے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ چنگاری لکڑی کے صرف ایک حصہ میں آباد ہے - اسی طرح سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ علمیت رُوح کے ایک جزو میں آباد ہے اور باقی جزو علم سے خالی ہے - لہٰذا اگر اُس کا ایک مقام علمیت سے پُر ہے تو اور سب مقامات بھی علمیت سے پر ہونگے - اسی لئے مولانا روم نے فرمایا ہے -

پیش شہر عقل کلی ایں حواس (۴) چوں خران چشم بستہ در خراس

دل کی خوبیوں اور گنجینۂ علم کے بارہ میں مثنوی میں درج ہے کہ

آنچہ اندر گفت باید سے شمر (۲۸) دہ حس ست و ہفت اندام دگر

بر پری و دیوزاں انگشتری (۲۹) چوں سلیمان دال ورہ مہتری

خاتم از دست تونستاند سد یو (۳۰) گر دریں ملکت بری باشی ز ریو

دو جہاں محکوم تو چوں جسم تو (۳۱) بعد ازاں عالم بگیرد اسم تو

عقل کل کی صورت مولنا روم نے اپنی مثنوی میں ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

کوست بابائے ہر آں کاہل قل ست کل عالم صورت عقل کل ست

اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام عالم عقل کل کی شکل ہے اور جتنے اہل قل (یعنی سخنوں) میں یہ اُن کا بابا ہے۔ یعنی عقل کل کے اندر کل کا کل عالم نظر آتا ہے۔ اور اُسکی وسعت بیان کے باہر ہے۔ فی الواقع ہمہ دانی کی یہی شکل ہے۔

———— ❁ ————

ٹکڑے ہو رہی ہے اِس کو پھر "فراہم" کرنا ہے۔ مولانا نے فرمایا ہے ؎

دشمنے داری چنیں در سرِّ خویش | مانع عقل ست و خصم جان کیش
(خود خودی میں ہے ترا دشمن چھپا | عقل کا دشمن ہے اور قاتل ترا)
ایں چنیں ساحر درونِ تست سر | اِنَّ فِی الوسواسِ سحراً مستتر
(ایسا جادوگر ہے اک تجھ میں نہاں | وسوسوں میں سحر پوشیدہ ہے ہاں)
ایں طلسم سحر نفس اندر شکن (۱۸) | شوئے گنج پیرِ کامل نقب زن
پس بدانی چونکہ استی از بدن (۱۹) | گوش و بینی چشم میدا اندر شدن
راست گفت ست آں شہِ شیریں زبان (۲۰) | چشم گردد مو بموئے عارفاں
پس چرا جادو جہاں روشن در جہاں (۲۱) | بے خبر باشند از حال نہاں

عارف لوگ اس بڑے راز کو ہر کس و ناکس کو نہیں بتاتے تھے۔ بلکہ کہتے تھے

چوں شوی محرم کشایم با تو لب (۲۲) | تا بہ بینی آفتاب نیم شب
چوں روانِ پاک او را شرق نے (۲۳) | در طلوعش روز و شب را فرق نے
روز آں باشد کہ او شارق شود (۲۴) | شب نماند چونکہ او بارق شود
چوں نماید ذرہ پیش آفتاب (۲۵) | خور چناں باشد دراں انوار و تاب
آفتابے را کہ رخشاں می شود (۲۶) | دیدہ پیش کند وحیراں می شود
ہمچو ذرہ بینیش در نور عرش (۲۷) | پیش نورِ بے حد موفور عرش

؎ بایزید بسطامی سے مراد ہے۔

پھر کبھی ضائع نہیں ہوتی ہے۔ موجودہ حالت میں وہ بھی مثل علمیت کے مادّی اثر کے باعث مفقود ہے۔ جو شخص مادی اثر سے نجات پائیگا اُس کو یہ ہمیشہ کے لئے حاصل ہوجاویگی۔ دین مادّی اثر سے نجات دلاسکتا ہے اسی لئے اسکو تکمیل خوشی کی راہ مانا ہے جیساکہ ہم اس سے قبل دیکھ چکے ہیں۔

روحانی سُرور بوجہ اسکے کہ وہ حواس خمسہ کی لذات کی قسم کا نہیں ہے۔ حواس سے پیدا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ جب کبھی بارِ تفکر سے رُوح کو نجات ملتی ہے اُس کا فوراً ہی احساس ہوتا ہے۔ مگر یہ حواس خمسہ سے منسوب نہیں ہے۔ دیکھو اگر کسی شخص کی خواہش ہے کہ وہ ایک کروڑ روپیہ جمع کرے۔ اور وہ ایک کروڑ روپیہ جمع کرلیتا ہے تو پریشانی سے آزاد ہوجانیکا اظہار اندرونی خوشی کی شکل میں اُسکے بشرہ سے نمایاں ہوتا ہے اور وہ فی الواقع خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا ہے۔ یہ خوشی روپیہ کی دستیابی کے باعث نہیں ہے۔ ورنہ جب ننیانوے لاکھ روپیہ اُسکے پاس ہو چکے تھے اُس وقت اُتنی مقدار میں خوشی بھی اسکو ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ شروع ہی سے خزانہ کی بڑھتی کے ساتھ بڑھتی رہتی۔ سچ تو یوں ہے کہ بمصداق اس کہاوت کے کہ جب منزلِ مقصود نزدیک آجاتی ہے شوق تیز تر ہوجاتا ہے۔ بیتابی اور بیقراری اور بھی بڑھ جاتی ہے اور ناکامیابی کا خوف اُس وقت پر خاص کر پریشان کر ڈالتا ہے۔ اسلئے یہ روپیہ کے اجتماع کا نتیجہ نہیں ہے۔ برعکس اسکے روپیہ کے حصول کے بعد تو نئی نئی طرح کی پریشانیاں اور پیدا ہوجاتی ہیں کہ اب اس روپیہ کو کہاں رکھیں۔ اسکی حفاظت

سرور جاودانی

رُوحانی خوشی کیا چیز ہے؟ اسکے سمجھنے کے لئے یہ جان لینا چاہیئے کہ خوشی تین قسم کی ہوتی ہے۔ اور دُکھ دو طرح کا۔

اوّلاً جسمانی خوشی یا لذت حواس خمسہ۔ یہ قیام پذیر نہیں ہوتی ہے اور حواس کی صحت پر اس کا دارو مدار رہتا ہے۔ قوائے جسمانی کمزور پڑے اور یہ خوشی نابود ہوئی۔

دوسری خیالی خوشی۔ جو من ہی من میں کسی لذتِ دنیاوی کا احساس کرنے سے جان پڑتی ہے۔ اس کا دراصل کوئی وجود نہیں ہوتا۔

تیسری رُوحانی خوشی۔ جو رُوح کی صفت ہی ہے۔ اس کا ذکر ابھی بعد کو بالتشریح کرینگے۔

دُکھ بھی جسمانی ہوتا ہے یا خیالی۔ اور لذاتِ حواس کے مقابل میں ہے۔ ایک میں رنج تو ایک میں راحت مفقود ہیں

رُوحانی خوشی رُوح کی صفت ہی ہے۔ اور اس وجہ سے کہ صفت کبھی موصوف سے علیحدہ نہیں ہو سکتی ہے ایک دفعہ پورے طور سے اظہار کو پا جانے کے بعد

کامیابی باعثِ خوشی نہیں ہوگی - بلکہ ناکامیابی اُس کا ذریعہ ہو جاویگی - یہ اِسی وجہ سے ہوگا کہ احساسِ آزادی کو کامیابی اور ناکامیابی سے فی الواقع کوئی سروکار نہیں ہے اُس کا تو صرف بارِ پریشانی سے نجات پا جانے سے تعلق ہے ؛

جو خوشی بارِ پریشانی کے دُور ہونے سے محسُوس ہوتی ہے وہ اندر ہی سے نمودار ہوتی ہے - باہر سے آتی تو حواس خمسہ میں سے کسی نہ کسی کے ذریعہ ہی سے آسکتی تھی - مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کا اِن سے تعلق نہیں ہے اِس لئے یہ اندر ہی سے پیدا ہوتی ہے - اب اندر تو جسمانی اعضا مثلاً تلی - گردہ پسلی - وغیرہ ہیں اور یا رُوح خود ہے - سو یہ ظاہر ہے کہ تلی گردہ وغیرہ مادّی اعضا میں خوشی کہاں سے آئی ؟ اِس لئے یہ رُوح ہی میں سے نمایاں ہُوئی اور کہیں سے نہیں آئی - مگر رُوح تو ایک مفرد شے ہے اُس میں کسی دوسری شے کے لئے جگہ کیسے ہوسکتی ہے کوئی بوتل تھوڑے ہی ہے کہ اُس میں چاہے جو کچھ بھر دیا جائے - اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کے احساس کا سُرور روح میں اس طرح سے نہیں بھرا ہوا ہے جیسے بوتل میں عرق یا شربت بھر دیا جاوے - بلکہ اُسکی صفت ہی ہے - کیونکہ صفت اور موصُوف ایک ہی ساتھ رہتے ہیں - اور ایک موصوف میں بہت سی صفات ہوتی ہیں جو اُس سے علیٰحدہ نہیں ہوسکتیں ؛

جب رُوح مادّی جسم سے کُلیتًا علیٰحدہ ہو جاویگی اُس وقت اُسکی ذاتی صفات

کیونکر کریں دغیرہ وغیرہ۔ فی الحقیقت روپیہ کے دیکھنے سے جو خوشی ہوگی وہ تو قوت باصرہ
کے ذریعہ ہی محسوس ہوسکتی ہے لیکن احساس آزادی کی خوشی جو حصولِ مدعائے دِلی
سے حاصل ہوتی ہے وہ اندھے کو بھی ہوسکتی ہے۔ اور یہی ٹھیک بھی ہے کہ اگر کل کے
کُل کروڑ روپیہ کا ڈھیر بھی آنکھوں کے سامنے لگا ہوا ہو اور یہ معلوم ہو جاوے کہ فی
الواقع یہ ڈھیر ننیانوے لاکھ کا ہی ہے۔ ابھی کروڑ پورا نہیں ہوا ہے تو باوجود روپیہ
کے چمکدار ڈھیر کے آنکھوں کے سامنے ہونے کے بھی پریشانی اور تفکر پھر آن گھیرینگے۔
پس تیسری قسم کی خوشی حواسِ خمسہ کی حد سے باہر ہے اور آزادی کا احساس ہے
جب امتحان میں کوئی لڑکا پاس ہوتا ہے تب بھی ایسی ہی خوشی اُسکو حاصل ہوتی
ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ خوشی اِس قسم کے الفاظ سے کہ تم پاس ہوگئے ہو
پیدا نہیں ہوسکتی ہے ایسے الفاظ تو ہم جا ہے جسکو لکھ کے دے سکتے ہیں لیکن اس کا
اثر ہر شخص پر نہیں پڑ سکتا ہے۔ اُن کو سُنکر تو وہی شخص خوش ہوگا جو امتحان دے چکا ہو
اور نتیجہ کا منتظر بیٹھا ہوا ہے اور جس کو ناکامیابی کی صُورت میں مزید پریشانی کا
مقابلہ کرنا ہے۔ چونکہ اس خبر کے پانے سے ہمیشہ کے لئے پریشانی کے بارسے
رہائی ہوجاتی ہے اِس لئے آزادی کا احساس خوشی کی لہر کے طور پر نمایاں ہوتا ہے
اور جتنی دیر تک روح دیگر قسم کے تفکرات کے بوجھ سے نہیں دبتی ہے۔ اُتنی دیر
تک برابر بنا رہتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر بعد امتحان دینے کے مدعائے دلی
تبدیل ہوگیا ہے یعنی بجائے کامیابی کے ناکامیابی مقصود ہوگئی ہے۔ تو خبر

ہے کہ رُوح خود ہی

خوش کنندہ است و خوش و عینِ خوشی بے خوشی نبود خوشی اے مرتضیٰ

(خوش ہے خود خوش ساز ہے اور خود خوشی بے خوشی کب ہو خوشی اے مدعی)

جو اِس وقت پورے طور سے نمایاں نہیں ہیں اور دبی ہوئی پڑی ہیں آزادی کیساتھ اپنا اپنا اظہار کر سکینگی - اور پھر وہ ہمیشہ نمایاں اور اثر پذیر رہینگی ۔ اُس وقت رُوح امر اور ہمہ داں ہو جاویگی اور سرورِ جاودانی اُسکو حاصل ہوگا - ؎

گر تو بکشائی ز باطن دیدۂ (۳۲) زود یابی سرمۂ بگزیدہ
دفع کن از مغز و از بینی زکام (۳۳) تاکہ ریح اللہ در آید در مشام
گفتم از چیزے نباشد در بہشت (۳۴) غیر ایں شادی کہ دارم در سرشت
چیست اندر خم کہ اندر نہر نیست (۳۵) چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست

آب خم اور نہر، خانہ اور شہر کیا ہیں ؟ سُنیئے -

ایں جہاں خم ہست دل چوں جوئے آب (۳۶) ایں جہاں حجرہ ست دل شہرے عجاب

دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے - کہ

ہم تو شاہ و ہم تو لشکر ہم تو تخت (۳۷) ہم تو نیکو بخت باشی ہم تو بخت
چوں تو باشی بخت خود اے معنوی (۳۸) پس تو کم بختی ز خود کے کم شوی

مگر یہ جان لینا چاہیئے کہ

بر تو ہم طمع خوشی ایں جہاں (۳۹) شد حجاب آں خوشی جاوداں

عشقِ حقیقی اگر پیدا ہو تو پھر یہ عارضی حجاب دُور ہو - کہا بھی ہے ؎

تو میرے ساتھ ہوتا ہے گویا
جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

اِس حجاب کا ذکر ہم پھر بعد کو زیادہ واضح طور سے کرینگے - یہاں پر اس قدر ہی ضروری امر

نہیں نہیں۔ فی الواقع ان سے بڑھکر اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ جو ان کو حاصل کر لیتا
ہے وہ ہی خدا کہلاتا ہے۔ انکے بغیر خداوندی نہیں ہو سکتی ہے۔ جنہوں نے معراجِ
کمال کو حاصل کر لیا ہے وہ بڑھاپے۔ غم۔ پریشانی۔ تکلیف۔ بدبختی۔ غفلت۔ وغیرہ
سے آزاد ہیں۔ اور ہمیشہ بے اندازہ کبھی کم نہ ہونے والے سُکھ کا مزہ لیا کرتے ہیں۔
جن درویشوں کو تھوڑا بہت بھی مزہ اس سرورِ جاودانی کا مل گیا ہے۔ وہ
مست ہو گئے ہیں۔ یہی رند ہیں جو مستی کے مارے پھُولے نہیں سماتے ہیں۔ وُہ
جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

پرلطف جام بادۂ وحدت ہے بے گماں ۔ بدمست ایک قطرہ کو پی کر ہوا ہوں میں

وہ اپنے کو خدا جانتے ہیں۔ اور وجد کی حالت میں صاف صاف اور معمولی
نیم خفیہ طور سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک عارف کہتا ہے۔ ؎

یا نُورِ خدائیم دریں دیر فتادہ (۴۰) یا آبِ حیاتیم دریں جوئے روانیم

دوسرا بانگ بلند لگاتا ہے۔ کہ ؎

منم خدا و بیانگِ بلند می گویم (۴۱) ہر آنکہ نُور دہد مہر و ماہ را اُویم

منصُور نے اسی انا الحق کے لئے سولی پر چڑھنا منظور کیا۔ عوام نے اُسکو کافر گردانا
لیکن واقف کارانِ راز نے اُسکی بات کو اپنایا۔ بایزید بسطامی بھی اِس فرقہ بدمستانِ
معرفت کے برگزیدہ تھے۔ شمس تبریز نے بھی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ مگر کہا یہی کہ

عجب من شمس تبریزم کہ گشتم شیفتہ برخود (۴۲) چو خود را خود نظر کردم ندیدم جز خدا در خود

باب ششم

روحِ پاک

اب ہم کچھ اوصاف روحانیت کو سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں ۔

روح ایک شے ہے جو نہ پیدا ہو سکتی ہے نہ مر سکتی ہے ۔ کیونکہ وہ مجرد یا مفرد شے ہے علمیت اور سرور اسکے صفات ذاتی ہیں سے دو مبارک صفات ہیں ۔

پس روح یا دوسرے الفاظ میں ہم خود فطرتاً امر عالم کل ۔ اور سرور حیاۃ دوانی کا خزانہ ہی ہیں ایسی پاک شے کے تمام صفات کسی طرح سمجھنے میں نہیں آسکتے ہیں معمولی اشیاء مثلاً سونا چاندی کے بھی اتنے صفات ہوتے ہیں کہ ان سب کا گننا ناممکن ہوتا ہے ۔ پھر روح کی تو بات ہی کیا ؟ اسکی شان میں کہا جا سکتا ہے ۔ کہ

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار ۔۔۔ گلچین بہارِ توز داماں گلہ دارد[1]

کیا ایسی تین چیزوں کے طلب کئے جانے کے بعد جیسے حیاۃ ابدی ۔ ہمہ دانی اور سرور جاودانی کسی اور شے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ۔ کیا ان سے بڑھکر کسی شخصیت میں ۔ یا کیا کسی چھوٹے یا بڑے خداوند یا خدا میں کوئی اور قابلِ تعریف یا قابل قدر صفت مل سکتی ہے ؟

[1] نگاہ کا وسیع دامن بھی چھوٹا ہے اور تیرے اوصاف کے پھول بہت کثرت سے ہیں ۔ اس لئے تیری بہار کا گلچیں اپنے دامنِ نگاہ کی شکایت کرتا ہے ۔

مثنوی میں مولانا نے فرمایا ہے ؎

پیر ایشان اند کایں عالم نبود (۴۸) جانِ ایشاں بود در دریائے جود

ناواقف شخص تو ایسے مضامین کو سنکر لال پیلا ہو جاویگا۔ مگر دانشمند ماہرِ راز انکا راز جانتا ہے۔ اور اپنی رازداری کا اظہار در پردہ تبسم کرتا ہے ؎

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما (۴۹) چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

اسے کوئی زیادہ چھیڑے تو وہ یوں کہدے گا۔

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم (۵۰) نہ ترسا و یہودی ام نہ گبرم نے مسلمانم

اصل یہ ہے کہ روح ہی قابلِ پرستش ہے۔ یہی خداوند ہے۔ یہی خود خدا ہے۔ مولانا روم نے فرمایا ہے۔

کانِ عودی در تو گر آتش زنند (۵۱) ایں جہاں از عطر و ریحان پر کنند

تو نہ آں عودی کز آتش کم شود (۵۲) تو نہ آں روحے کاسیرِ غم شود

تو مکانی اصلِ تو در لامکاں (۵۳) ایں دکاں بر بند و بکشا آں دکاں

روح مثل طوطی کے ہے۔ مگر دیکھئے ظاہر میں کیا ہے اور واقعی کیا ہے؟

قصۂ طوطی جاں زینساں بود (۵۴) کو کسے کو محرمِ مرغاں بود

کو یکے مرغے ضعیفے بے گناہ (۵۵) واندرونِ او سلیماں با سپاہ

چوں بنالد زار بے شکر و گلہ (۵۶) افتد اندر ہفت گردوں غلغلہ

طوطیٔ کاید ز وحی آوازِ او (۵۷) پیش آغاز و جود آغازِ او

مولنا روم جنکی مثنوی مرتبہ کے لحاظ سے اسلامی دنیا میں حدیث کے بعد درجہ پاتی ہے منصور کے قاتلوں کے لئے فرماتے ہیں۔

چوں قلم در دست غدارے بود (۴۳) لاجرم منصور بردارے بود

چوں سفیہاں را بود کاروکیا (۴۴) لازم آمد یقتلون الانبیاء

فی الحقیقت لوگوں کو راز روحانیت معلوم نہیں ہے اور نہ یہ آسانی سے مل ہی سکتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ حق شناسوں کے خلاف رہے ہیں اور جاہلوں کے بھڑکانے سے جلد ہی بھڑکتے اور عارفان حق کو ایذا پہنچاتے رہے ہیں۔ انکو اس بات کا پتہ ہی نہیں چلا کہ درویش کیوں اپنے کو خدا فرماتے ہیں۔ ذیل کے اشعار تو غالباً انکے پارۂ مزاج کو آخری درجہ تک پہنچا دینے کے لئے کافی ہیں ؎

گرد خود گردی غنی چند کنی طوف حرم (۴۵) رہبرے نیست دریں راہ بہ از قبلہ نما

بیہودہ سر اد بپئے او می گردی (۴۶) بنشیں او خدا است اگر خود می آید

اس طرز پر ایک اور بزرگ کا کلام ہے کہ ؎

من آں وقت بودم خدا ہم نبود

من آن وقت کردم خدا را سجود (۴۷) کہ ذات و صفات خدا ہم نبود

ایک اردو میں کلام کہنے والے عارف ان سے بھی ایک قدم آگے ہی بڑھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں ؎

میں نے مانا ہر کو حق نے کیا پیدا ولے میں وہ خالق ہوں مرے کن سے خدا پیدا ہوا

توئی عاشق بظاہر در طریقت (۶۷) توئی معشوق باطن در حقیقت
گر بکنہ خود ترا باشد رہے (۶۸) از خدا و خلق بے شک آگہے
ہم ازیں گفت ست در بحر صفا (۶۹) نیست اندر جبہ ام غیر از خدا

اور سنیے

عین آبی آب می جوئی عجب (۷۰) نقد خود را بستاں ہیگوئی عجب
بادشاہی از چہ میمانی گدا (۷۱) گنجہا داری چرائی بے نوا

آگے چلکر اسے اور بھی صاف کر دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

یار پنہان ست در زیر نقاب (۷۲) ہمچو دریا کو نہاں شد در حباب
پردہ بردار و جمال یار بیں (۷۳) دیدہ وا کن چہرۂ اسرار بیں
کشف در معنی بود رفع حجاب (۷۴) بود تو آمد بروئے تو نقاب

اسی لہجہ میں ایک اور صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

اے خلق بہ حج رفتہ کجائید کجائید (۷۵) معشوق ہمیں جاست بیائید بیائید
معشوق تو ہمسایہ تو دیوار بدیوار (۷۶) در بادیہ سرگشتہ چرائید چرائید

یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ فلسفہ کا استدلال ہے۔ جو پوشیدہ راز کو کہیں صاف صاف الفاظ میں اور کہیں قدرے چھپا کر ظاہر کرتا ہے اور بالآخر کہہ ہی دیتا ہے۔

ہمیں ہیں جنکو دنیا پوجتی ہے روز و شب دیکھو!!
ہمیں ہیں جنکو انساں ڈھونڈھتے ہیں سب کے سب دیکھو!

اندرونِ تست آں طوطی نہاں (۵۸) عکسِ اورا دیدہ برایں وآں

یہ وہی رازِ سربستہ ہے جو خفیہ چلا آتا تھا۔ اور کسی کو معمولاً نہیں بتایا جاتا تھا۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

آں دمے کز آدمش کردم نہاں (۵۹) با تو گویم اے تو اسرارِ جہاں

آں دمے را کہ نہ گفتم با خلیل (۶۰) واں دمے را کہ نداند جبرئیل

پھر بھی مولٰنا فرماتے ہیں ؎

گہ تو ئی گویم تُرا گاہے منم (۶۱) ہر چہ گویم آفتابے روشنم

ہر کجا تابم ز مشکات دمے (۶۲) حل شد آنجا مشکلاتِ عالمے

ہر کجا تاریکی آمد ناسزا (۶۳) از فروغِ ما شود شمس الضحیٰ

ظلمتے را کآفتابش بر نداشت (۶۴) از دمِ ما گردد آں ظلمت چو چاشت

الغرض کہاں تک کہا جائے ؎

بادہ از ما مست شد نے ما ازو (۶۵) عالم از ما ہست شد نے ما ازو

بات یہ ہے کہ پردۂ جہالت کے باعث رُوح اپنی ذات سے ناواقف ہے۔ اور اس لئے اگر اس سے کوئی کہے بھی کہ تو ہی خدا ہے تو وہ چونکتا ہے۔ ورنہ

ذرہ دل خوابِ غفلت سے اگر بیدار ہو جائے　　نظر جس پر کرے وہ صاحبِ اسرار ہو جائے

اِسی خیال کو سامنے رکھکر ایک برگزیدۂ حق نے فرمایا ہے

نشانِ رُوح بر من حیرت آمد (۶۶) نشان از وے بگفتن غیرت آمد

فی الحقیقت رِند مست شرابی نہیں ہے۔ بلکہ اسکی مستی روشنی روحانیت کی بدولت ہے
اُن کا حال اشعارِ ذیل سے ظاہر ہے ؂

خود اپنے ہی جمال پہ عاشق ہوا ہوں میں
اپنی ہی ذاتِ پاک کا شیدا ہوا ہوں میں
عاشق ہوں اپنا صورتِ عالم رقیب ہے
واصل فنا سے ہو کے بقا چاہتا ہوں میں
کب غیر سے علاجِ دلِ مضطرب بنے
خود درجۂ مسیح کا طالب ہوا ہوں میں
پُرلطف جام بادۂ ہستی ہے بیگماں
بدست ایک قطرہ کو پیکر ہوا ہوں میں
اسرارِ نورِ وحدتِ اعلیٰ کا حال سُن
معکوس ہو کے خود میں خدا ہو گیا ہوں میں
خود کو خودی میں ڈھونڈ خودی کو بھی ڈھونڈ نکال
پھر تُو ہی خود کہے گا خدا ہو گیا ہوں میں

سورۂ ذاریات میں اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ہم انسان کے گلے کی رگ سے بھی نزدیک تر ہیں۔ سورۂ واقعہ میں فرمایا ہے کہ ہم تمہاری نسبت انسان سے نزدیک تر ہیں۔ لیکن تم دیکھتے نہیں ہو۔ سورۂ فتح میں تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ تیرے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں وہ تیرے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیتے بلکہ خدا کے ہاتھ میں

ہمیں ہیں جنکی ہوتی ہے پرستش دیر و کعبہ میں
ہمیں ہیں عارفانِ حق جنہیں کہتے ہیں رب دیکھو!

مگر بکتیں فلسفہ کی غرض سے روح مثل مرغ کے ہے۔ کیسے مرغ کی مثل ہے۔ سُنئیے۔

من چو مرغِ اوجم اندیشہ مگس (۷۷) کے بود بر من مگس را دسترس
چوں ملالم گیرد از سفلی صفات (۷۸) بر پرم ہمچو طیور الصافات

اور وہ پر بھی جو اڑنے میں مددگار ہونگے کوئی عارضی نہیں ہیں۔ یہاں معاملہ وہ نہیں ہے کہ جسکو ہم "رفتن بپائے مردئی ہمسایہ در بہشت" کی صورت کا خیال کریں۔ خود اپنی ہی طبیعت سے کام لیا جاتا ہے۔

پرِ من رستہ است ہم از ذاتِ خویش (۷۹) بر نہ چسپانم دو پر من از سریش

ایک صوفی کا قول ہے۔

(۸۰)
تجلی ہاست حق را در نقاب ذات انسانی
شہود غیب گر خواہی وجوب اینجاست امکانی

ایسا ہی پھر بھی کہا ہے

درحقیقت خود توئی اُمّ الکتاب (۸۱) خود ز خود آیاتِ خود را باز یافت
لوحِ محفوظ است در معنی دلت (۸۲) ہر چہ میخواہی شود زو حاصلت
صورتِ نقشِ الٰہی خود توئی (۸۳) عارفِ اشیا کماہی خود توئی
آنچہ مطلوب جہاں شد در جہاں (۸۴) ہم توئی او باز جو از خود نشان

جو روحانیت میں پختہ ہو گئے ہیں وہ اِس سے کبھی نہیں ہٹ سکتے ہیں۔ کتنی ہی آفت و مصیبت آئے وہ یہی کہیں گے کہ خدا ہوں ہیں خدا ہوں ہیں۔ اِسی لئے کہا بھی ہے

اُتاریں کھال عارف کی مخالف گرچہ سب مل کے
صدا ہر روم سے نکلے۔ خدا ہوں میں خدا ہوں میں

منصور جیسے پختہ مغزان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

کہا منصُور سے تُو باز آ اپنے عقیدے سے
پڑی جب آنکھ شولی پہ تو بولا مَیں خدا ہُوں میں

بایزید بُسطامی کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ وجد میں فرمانے لگے "من خدا ہستم۔ من خدا ہستم" آپکے شاگردوں میں سے کچھ ایسے بھی وہاں موجود تھے جو رازِ معرفت سے ابھی واقف نہ تھے لیکن محض آپ کی شہرت سنکر ہی آپکے معتقد ہو گئے تھے اُنکو آپ کا ایسا کہنا بہت ناگوار گذرا جب شیخ ہوش میں آئے تو اُنہوں نے کہا کہ حضرت آج وجد کی حالت میں آپکے منہ سے کلمۂ کفر کئی بار نکلا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا واقعی میرے منہ سے کلمۂ کفر کو نکلتے ہوئے تم نے سُنا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہاں تب فرمایا کہ اگر آئندہ ایسا پھر بھی کبھی ہو تو تم فوراً زبان کاٹ لینا۔ اِسکے کچھ عرصہ کے بعد ایک دن پھر شیخ کو وجد طاری ہوا۔ اور پھر وہی کلمۂ روحانیت آپ کی زبانِ مبارک سے جاری ہوا۔ ناواقف شاگردوں کو تو اب اجازت مِل ہی چکی تھی۔ اُنہوں نے اُسیوقت چھری زبانِ مبارک کے کاٹ ڈالنے کے لئے چلائی۔ مگر کہا جاتا ہے کہ جس نے شیخ کے

ہاتھ دیتے ہیں۔ پھر سورۂ ذاریات میں تو پردہ ہی اُٹھا دیا۔ جب یہ کہدیا کہ ہم تمہاری ذات میں ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے ہو۔

حدیث میں بھی آیا ہے کہ میں عرب ہوں بغیر ع کے۔ بغیر عین کے عرب خالی رب کہلاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا ہے میں احمد ہوں بغیر م کے یعنے احد ہوں جو وحدانیت کا اظہار کر رہا ہے۔

الغرض کہاں تک کہا جائے۔ راز سربستہ جو برسوں کے امتحان کے بعد درویشان باکمال اپنے مریدوں کو بتایا کرتے ہیں یہی ہے۔

خدا ہوں ذاتِ باری ہوں۔ خدا ہوں میں خدا ہوں میں
بلند آواز سے کہتا ہوں میں کہ میں خدا ہوں میں
بلا شک ذاتِ پاک ربِّ دوعالم ہوں کامل ہوں
ہے معبود ملائک جو وہی ہوں میں خدا ہوں میں
جو منکر ہے اُسے کہدو عبث انکار کرتا ہے
خود اپنے دِل سے گر پوچھے تو کہدے میں خدا ہوں میں
ہوں برتر جملہ عالم سے نہیں مجھ سے کوئی برتر
بھٹکتے کا سہارا ہوں۔ خدا ہوں میں خدا ہوں میں
خدا کی جتنی صفتیں ہیں۔ سب ہی موجود ہیں مجھ میں
خدا کا ہم صفت ہوں میں۔ خدا ہوں میں خدا ہوں میں

دُرچہ دریا بہ نہاں در قطرہ　آفتابے مخفی اندر ذرہ

دُر تو کیا دریا ہے قطرہ میں نہاں　اور ذرہ میں ہے مہر ضو فشاں

اُوپر وار کیا اُسکی چھری خود اُسی کے لگی شیخ کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

فی الحقیقت

ہم ملک ہم عقل حق را واجدی	ہر دو آدم را معین و ساجدی
ہے ملک اور عقل کو حق کا یقین	دونوں ہی آدم کے ساجد اور معین
نفس شیطاں نیز زاول واحدے (۸۵)	بود آدم را عدو و حاسدے
آنکہ آدم را بدن دید او رمید	وانکہ نورِ مؤمن دید او خمید
جس نے آدم کو بدن سمجھا پھرا	نور کا جس نے اسے دیکھا جھکا
عقل و عقل و جان و جاں ایجان توئی (۸۶)	عقل و جان و خلق را سلطان توئی
عقل کل برگشتہ و حیرانِ تست (۸۷)	کلِ موجودات در فرمانِ تست
پارہ دوزی میکنی اندر دکان (۸۸)	زیر ایں دوکانِ تو پنہاں دوکان
ہست ایں دوکاں کرائی زود باش (۸۹)	تیشہ بستان و تگش را میخراش
پارہ دوزی چیست خوردن آب و نان (۹۰)	میزنی ایں پارہ بر دلق گراں
ہر زماں میدار داین دلق تنت (۹۱)	پارہ بر وے میزنی زیں خوردنت
اے زنسل بادشاہے کامگار (۹۲)	باخود آ زیں پارہ دوزی ننگ دار
پارہ برکن از یں قعرِ دکان (۹۳)	تا برآرد سر بہ پیش تو دوکاں
پس ازاں کایں مہلتِ خانہ گری	آخر آید بر نخوردہ زو برے
(ختم مدت گر کرایہ کی ہوئی	جائے گا دوکاں سے پھر ناکام ہی)

الغرض جس نے اپنی رُوح کو ٹھیک طرح سے سمجھ لیا اُس نے یہی پایا کہ

"تا تو تن را چرب و شیریں میدہی (۹۷) جوہر جاں را نہ بینی فربہی

تن ناپاک ہی ہے کسی وقت میں بھی وہ پاک نہیں کہا جا سکتا۔ اور غسل اور صابن بھی اُسکو صاف نہیں رکھ سکتے ۔ یہ اسقدر ناپاک و گندہ ہے کہ جو چیز اس سے چھو جاتی ہے وہ گندی ہو جاتی ہے ۔ مرتے وقت اسکی اصلی حالت نظر آتی ہے ۔

گر میان مشک تن را جا شود (۹۸) روز مردن گند او پیدا شود

سمجھدار لوگ اِسکو دشمن سمجھتے ہیں ۔ جو بڑی مشکل سے مرتا ہے اِسی لئے ہدایت ہوتی ہے کہ ؎

زندگی تن مجواز عیسیت (۹۹) کام فرعونی مخواہ از موسیت

اِسکی مٹی اور آب جن سے یہ بنا ہے دشمنِ جان ہیں ؎

زانکہ ایں آب و گلے کابدانِ ماست (۱۰۰) منکرو دزوضیائے جانہاست

دیکھ غافل نہ ہو ۔ اسکے ساتھ دشمن کا سا برتاؤ کر ۔ مروت و محبت اُس کے لئے نہیں ہے ۔ اسکو تو جڑ مول سے غارت ہی کرنا ہے ۔ اور اس طرح سے غارت کرنا ہے کہ اِسکی نسل ہی آگے کو نہ چلے مثنوی میں اِسی لئے آیا ہے ۔

گر ہمے خواہی کہ مشکل حل شود (۱۰۱) خارِ محرومی بہ گل مُبدل شود

گر ہمے خواہی کہ آں خلعت رسد (۱۰۲) پس بگریاں طفلِ دیدہ بر جسد

مطلب یہ ہے کہ اِس جسم کو آتشِ ریاضت سے اِس طرح جلا کہ طفلانِ چشم کے آنسو نکل آویں ۔

باب ہفتم

تن خاکی

اَب جبکہ رُوح خود خدا ہے تو یہ تن خاکی کیا چیز ہے ؟

یہ قید خانۂ رُوح ہے۔ اِس میں رُوح ایسی سختی سے بندھی ہُوئی ہے کہ دم مارنا مشکل ہے۔ بال برابر جنبش بھی وہ اِس میں نہیں کر سکتی ہے۔ مولنٰا رُوم فرماتے ہیں ؎

بند آہن را تواں کردن جدا (۹۴) بند غیبی را نداند کس دوا

بند پنہاں لیک از آہن بتر (۹۵) بند آہن را کند پارہ تبر

یہ غیبی بند ہی باعثِ خرابی ہیں۔ یہی رُوح کی خداوندی کا اظہار نہیں ہونے دیتے ہیں۔ جب کسی پرندے کے پر سی دیئے جاویں تو باوجود اُڑنے کی طاقت رکھنے کے بھی وہ اُڑ نہیں سکتا ہے اسی طرح قیدِ جسم میں پڑی ہُوئی رُوح اپنی ذاتی رُوحانیت سے محرُوم ہے۔

مگر دُنیا غفلت میں پاگل ہو رہی ہے لوگ تنِ خاکی کو ہی حیات سمجھتے ہیں۔ رُوح کی خبر بھی اُنکو نہیں ہے۔ اُسکی خداوندی کی تو بات ہی کیا ہے۔ اُنہیں کو جگانے کے لئے کہا ہے ؎

کیست بیگانہ تنِ خاکی تو (۹۶) کز برائے اوست غمناکی تو

ارے یہی تو دشمن ہے۔ اور تو اُسی کی خاطر تواضع میں لگا ہُوا ہے ⁺

جوہر صدقت خفی شد در دروغ (۱۱۲) ہمچو طعم روغن اندر طعم دوغ
آں دروغت ایں تن خاکی بود (۱۱۳) راستت آں جانِ ربانی بود
سالہا ایں دوغِ تن پیدا و فاش (۱۱۴) روغنِ جاں اندرو فانی و لاش
روغن اندر دوغ پنہاں می شود (۱۱۵) ہرچہ میسازی تواش آں میشود

آگے اور بھی واضح طور سے کہتے ہیں۔

چیست آں کوزہ تنِ محصور ما (۱۰۳) اندراں آب و حواس شور ما

کوزۂ ما پنج لولہ پنج حس (۱۰۴) پاک دار ایں آب را از ہر نجس

تا شود ایں کوزہ منفذ سوئے بحر (۱۰۵) تا بگیرد کوزۂ ما خوئے بحر

بے نہایت گردد آبش بعد ازاں (۱۰۶) پُر شود از کوزۂ ما صد جہاں

یہ افزونی روحانیت اس کوزہ گلی کے توڑنے سے ہی مل سکے گی کسی اور طرح سے

نہیں مولٰنا فرماتے ہیں ؎

آں سبوئے تنگ پر ناموس و ننگ — شد حجاب بحر زن او را بسنگ

تو جو نازاں ہے سبوئے تنگ پر — پردہ ہے یہ مار اسکو سنگ پر

المختصر

ہر کہ شیریں می زید او تلخ مُرد (۱۰۷) ہر کرا تن را پرستد جاں نبرد

تن چو اسمٰعیل جاں ہمچو خلیل (۱۰۸) کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل

میل جاں اندر حیات و در حی ست (۱۰۹) زانکہ جان لامکان اصل ویست

میل جاں در حکمت ست و در علوم (۱۱۰) میلِ تن در باغ و راغ و در کروم

میل جاں اندر ترقی و شرف (۱۱۱) میل تن در کسب اسباب و علف

مکھن اور چھاچھ کا معاملہ ہے۔ مکھن چھاچھ میں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح سے جان جسم میں

پوشیدہ ہے۔ ؎

دنیا ہی میں لین ہو جاتے تھے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ یہ دنیا دوسری دنیا کے طالبوں کے لئے منع ہے۔ دوسری دنیا اِس دنیا کے چاہنے والوں کو منع ہے۔ اور ہر دو دنیا سچے حق پرست کو منع ہیں (دیکھو کتاب موسومہ بہ دُر ویشئر)

واضح رہے کہ حوروں کی جنت میں بھی جو کچھ خوشی مل سکتی ہے وہ بیرونی اشیاء کی یعنے حواسِ خمسہ کی ہی بدولت مل سکے گی۔ روحانیت کی خوشی تو اپنے ہی اندر ہے۔ جنت یا غیر جنت سے اُس کا تعلق نہیں ہے۔ اُسکو تو وہی پاویگا جو باہر سے کلیتاً مُنہ موڑ کر اندروں کی طرف متوجّہ ہوگا۔ اِسی لئے درویشان کرام کی یہی ہدایت ہے کہ اوّلاً انسان کو مرنا ہوگا تب وہ فقیری کو حاصل کر سکے گا۔

اِس عالمِ ظاہری و فانی کے جملہ اسبابِ انسان کے من کے لوبھانے والے ہیں انکے حربہ سے بچنا مشکل کام ہے وہ ہی اِن سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جو اپنے نفس کو بالکل مُردہ بنا دے۔ ۵۔

ترکِ لذتہا و شہوتہا سخاست (۱۱۹) ہر کہ در شہوت فرو شد برنخاست

کُندہ تن راز پائے جاں بکن (۱۲۰) تا کند جولاں بپائے ایں چمن

نفس کشتی باز رستی زاعتذار (۱۲۱) کس ترا دشمن نباشد در دیار

از پئے ایں دنیائے خوش بر تست تنگ (۱۲۲) از پئے او با حق و با خلق جنگ

پس بکش او را کہ ہمسرا و دنی (۱۲۳) ہر دمے قصدِ عزیزے می کنی

چند گوئی من بگیرم عالمے (۱۲۴) ایں جہاں را بر کنم از خود ہمے

دُنیائے خاکی کی مددگار ہے۔ اُسکی راحتوں کو مہیا کرتی ہے۔ اور پھر اُسکے ذریعہ روح کو لُوٹ لیتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دنیا کی محبت تمام تباہیوں کی جڑ ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ مثل قیدخانہ یا قحط کے ہے۔ اور جب اس میں سے نکلتے ہیں تو تم کہہ سکتے ہو کہ وہ قیدخانہ اور قحط سے نکلے۔ اِس جہان میں مثل مسافر کے رہو۔ اور اپنے تئیں مردہ سا سمجھو۔ کیونکہ

وائے آں زندہ کہ بر مُردہ نشست (۱۱۶) مُردہ گشت و زندگی از وے بجست

کیونکہ یہ جہان نیست ہونے والا یعنی مردہ ہی ہے۔ اسکی محبت سے نیستی ہی پلے بندھیگی

ایں جہاں نفی است در اثبات جو (۱۱۷) صورتت صفرست در معنات جو

روحانیت کی دنیا اصل ہے۔ مگر اُسکے پنہاں ہونے کے باعث اِسی کو عوام کی نگاہ میں فروغ ہے ؎

ایں جہانے ہست چوں ہستاں شدہ (۱۱۸) واں جہانے ہست بس پنہاں شدہ

جو زندگی کو چاہتا ہے اُس کو اس خاکی جہان سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا ہے بہشت بھی اسی فانی جہان کا ایک نقشہ ہے۔ درویشان باکمال اس راز سے اچھی طرح سے واقف تھے اور وہ دونوں جہانوں کی محبت سے مُنہ موڑ کر حق یعنی اپنی روحانیت کی

اے برادر صبر کن بر درد نیش　(۱۳۵) تا رہی از نیشِ نفس گبر خویش

حسد کو بھی طالبِ حق کے دل میں رہنے کے لئے جگہ نہیں ہے۔

خود حسد نقصان و عیب دیگر ست　(۱۳۶) بلکہ از جملہ کمیہا بدتر است

پاک کن دو چشم را از موئے عیب　(۱۳۷) تا بہ بینی باغ و سربستان غیب

شہوت نفس پرستی سب خرابیوں کی جڑ ہے اسکو تو جڑ سے ہی کاٹنا اچھا ہے۔

چوں شما ایں نفس دوزخ خوئے را　(۱۳۸) آتشی و گبر فتنہ جوئے را

جہد ہا کردید تا شد پُر صفا　(۱۳۹) نار را کشتید از بہر خدا

آتش شہوت کہ شعلہ مے زدے　(۱۴۰) سبزہ تقوی شد و نور ہدی

آتشِ خشم از شما ہم حلم شد　(۱۴۱) ظلمتِ جہل از شما ہم علم شد

آتشِ حرص از شما ایثار شد　(۱۴۲) داں حسد چوں خاید گلزار شد

دوسروں کے عیب نہیں دیکھنے چاہئیں اور ملیں تو انکو اپنی ہی ذات میں ڈھونڈنا چاہیئے۔

اے خنک جانے کہ عیب خویش دید　(۱۴۳) ہر کہ عیبے دید آں بر خود خرید

ہر کہ نقص خویش را دید و شناخت　(۱۴۴) اندر استکمالِ خود دو اسپہ تاخت

حرص سب سے ناقص چیز ہے۔ کہا ہے کہ۔

کوزۂ چشمِ حریصاں پُر نشد　(۱۴۵) تا صدف قانع نشد پُر در نشد

شہوت تو سب سے سخت دشمن ہے یہ تو کھڑے کھڑے مارتا ہے

ہاسگاں بگذار ایں مُردار را (۱۲۵) خرد شکن شیشہ پندار را

ہر کہ مرد اندر تنِ او نفس گبر (۱۲۶) مر ورا فرماں برد خورشید و ابر

یہ نفس گدھے کی طرح ہے اس کو مطلق العنان نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ قابو میں رکھنا چاہیئے۔ مولٰنا رُوم نے فرمایا ہے۔

ہیں! بہل خر را و دست آرِ و بلد (۱۲۷) زانکہ عشق اوست سُوئے سبزہ زار

دشمن راہ است خر مستِ علف (۱۲۸) اے بسا خر بندہ را کردہ تلف

گر یکے دم تو بغفلت وا ہلیش (۱۲۹) او رود فرسنگہا سوئے حشیش

گردنِ خر گیر و سُوئے راہ کش (۱۳۰) سُوئے رہبانان و رہدانانِ خوش

فی الواقع یہ نفس بڑا زبردست گدھا ہے۔ چڑنا اور بے وقت کا رینگنا ہی اسکے کام ہیں۔ اِس پر فتح پانی مشکل ہے۔ کامیابی کی ایک ہی ترکیب ہے "حصولِ رازِ معرفت" اگر ہونہار اچھی ہے اور بخت بلند ساتھ لایا ہے۔ کوئی رہبر ملجاویگا۔ نہیں تو کم از کم اِس ہدایت پر عمل کرے ؎

گر ندانی راہ انچہ خر نخواست (۱۳۱) عکسِ آں را کُن کہ ہست آں راہِ راست

مشورت با نفس خود گر می کُنی (۱۳۲) ہر چہ گوید کُن خلافِ آں دنی

مشورت با نفس خود اندر فعال (۱۳۳) ہر کہ گوید عکسِ آں باشد کمال

نفس کشی ہی فی الحقیقت راہِ نجات ہے۔ اگر تُو نے نفس کو نہیں مارا تو وہ ضرور تجھ کو مارے گا۔ سب قسم کے جذبات فاسد نکالنا ہوگا۔ حلم و صبر کو دل میں جگہ دینی ہوگی۔

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر (۱۳۴) بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

زانکہ خوئے بد بگشتت استوار — مور شہوت شد ز عادت ہمچو مار

اور بھی فرماتے ہیں کہ

زنگ تو بر توت اے دیگ سیاہ — کرد سیماے درونت را تباہ

بدولت زنگار بر زنگار ہا — جمع شد تا کور شد ز اسرار ہا

غرض مختصر نفس کشی ہر طریق سے کرنی ضروری ہے ورنہ روحانیت کی بجائے عذاب قید مادی کا مقابلہ ہے۔ اس عالم میں کس قدر پریشانی اور عذاب ارواح کو سہنے پڑتے ہیں۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے ہے۔ فی الحقیقت اس ہستی میں سوائے عذاب کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور جو ایک بار دنیا میں کسی کو شہد راحت کی مل بھی جاتی ہیں تو وہ اس قدر پریشانی و درد گردانی سے حاصل ہوتی ہیں کہ جن کا کوئی حساب ہی نہیں۔ اور وہ حاصل ہو کر پھر وہ ہیزم خشک کا کام کرتی ہیں۔ آتش شہوت کو اور بھڑکاتی ہیں۔ اسکو ہمیشہ فروکرتی نہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ لذاتِ حواس کی وہ حالت ہے جو برف کے پانی کی ہے۔ جسکو اسکی خواہش نہیں ہے اسکو ناگوار معلوم ہوتا ہے اور جسکو بخار چڑھا ہوا ہے اسکو راحت بخش بیان پڑتا ہے۔ اگر بخار خواہشات اتر چکا ہے۔ تو لذات دنیا باعث راحت نہیں ہوتی ہیں۔ ہاں جہاں بخار چڑھا ہوا ہے۔ وہاں وہ اچھی معلوم پڑتی ہیں اور پھر دل کی تپش بیان افزونی کرتی ہیں۔ انکا ترک ہی راہِ نجات ہے۔ اسی لئے درویشوں کی تعلیم ہے کہ

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست — تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

زانیاں راگندہ اندام نہاں (۱۴۶) خمر خواراں را بود گندہ دہاں

نارِ بیرونی بہ آبے بفسرد (۱۴۷) نار شہوت تابدوزخ مے برد

نار دوزخ مے نیارامد بہ آب (۱۴۸) زانکہ دارد طبع دوزخ در عذاب

شہوت ناری براندن کم نشد (۱۴۹) آں بماندن کم شود بے ہیچ بد

تاکہ ہیزم مے نہی بر آتشے (۱۵۰) کے بمیرد آتش از ہیزم کشے

چونکہ ہیزم بازگیری نار مرد (۱۵۱) زانکہ تقوےٰ آب سوئے نار برد

فریب وریاکاری بھی ترک کرنی چاہیئے۔

ظاہر و باطن اگر باشد یکے (۱۵۲) نیست کس را در نجاتِ او شکے

سخاوت کے ذریعے بخل سے پیچھا چھڑانا چاہیئے۔

غلِ بخل از دست وگردن دور کن (۱۵۳) بخت تو دریاب از چرخ کہن

کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ جس نے نفس کی ہوا وہوس سے اپنے کو آزاد کرلیا وہ صاحب کمال ہوا۔

ہر کہ خود را از ہوا خود باز کرد (۱۵۴) گوشِ خود را آشنائے راز کرد

غرور نو سو خرابیوں کی جڑ ہے اور عارضی وفانی شے کا غرور ہی کیا کرے

چوں بنوبت می دہند ایں دولتت (۱۵۵) از چہ شد بر باد آخر سبلتت

لیکن برعکس اسکے جس نے نفس پرستی میں ہی سارا وقت صرف کرڈالا اُسکی بدبختیوں کی بنیاد اور بھی مستحکم بن گئی۔

چونکہ جزو دوزخ است ایں نفس ما　　طبع کل دارد ہمیشہ جزو ہا

از سموم نفس چوں با علّتی　　ہر چہ گیری تو مرض را آلتی

انبیا را تنگ آمد ایں جہاں　　چوں شہاں رفتند اندر لامکاں

مردگاں را ایں جہاں بنمود فر　　ظاہرست رخت و بمعنی تنگ تر

نفس و شیطاں ہر دو یکزیں بودہ اند　　در دو صورت خویش را بنمودہ اند

بند بگسل باش آزاد اے پسر چند باشی بند سیم و بند زر

جہاد کا بھی اصلی مطلب یہی ہے کہ تو اپنے نفس سے لڑے۔ سب سے بڑا کافر یہی ہے اور بڑا زبردست کافر بھی یہی ہے۔ اور کافر تیرے دشمن نہیں ہیں یا ہیں تو وہ تیرے جان و زر سے ہی مخالفت کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو تیرا ایمان بات کی بات میں برباد کر دیتا ہے۔

سہل شیرے دانکہ صفہا بشکند شیر آنست آنکہ خود را بشکند

جہد کن تا ترک غیر حق کنی دل ازیں دنیائے فانی بر کنی

اے خنک آنکو جہادے میکنی بربدن زجرے و دادے می کنی

اسی کی تشریح میں ہے کہ۔

مارنا دل کا سمجھتا ہوں جہادِ اکبر وہی غازی ہے بڑا جسنے یہ کافر مارا

اور اور شاعر کا کلام ہے۔

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
پلنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
کسی بیکس کو لے بیدادگر مارا تو کیا مارا

پس جبکہ یہ نفس دوزخی ہے تو تجھ کو چاہیئے کہ قبل اسکے کہ یہ تجھ کو مارے تو ہی اسے غارت کر دے ؎

معطر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ ؎

رفتن یک منزلے بربوئے ناف — بہتر از صد منزل وگام و طواف

اتنا ہی فرق بس زاہد اور رند عارف میں ہے۔ اس نے ہرن کو نہیں دیکھا ہے وہ صرف نقش پا کا کھوجی ہے۔ رند ہرن سے واقف ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسکے مشک کی خوشبو بھی سونگھتا رہتا ہے۔ ایک نے خالی بیرونی پردہ کو دیکھا ہے اور دوسرا جمال تخت نشین سے جو پس پردہ ہے واقف ہے۔ اور فیض رندانہ اسی سے فیضیاب ہوتا ہے ؎

سیر زاہد ہر مہے تا پیشگاہ — سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

ان سب باتوں کو جو جانتا ہے وہ سیر ریاضت سے واقف ہو جاتا ہے۔

تا ز رنج آں جہانے وارہد — بر خود ایں رنج عبادت می دہد

واضح رہے کہ درویش جنت کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا بھی متلاشی نہیں ہے آخر وہ بھی تو بیرونی شئے ہی ہے اور فانی ہے۔ اصل شئے تو اندر ہے۔ اور حواس خمسہ کی حد قدرت کے باہر ہے۔

ریاضت میں رنج خود نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ترک لذات میں جو وقت قطعاً سامنے آتی ہے اسکو بھی بصد خوشی برداشت کرتے ہیں۔

تا بقائے خود نیابد سالکے — چوں کند تن را سقیم و ہالکے

مردن تن در ریاضت زندگیست — رنج ایں تن روح را پایندگیست

ریاضت

ترک دنیا کی کڑی منزلیں ہیں۔ مگر گل بغیر خار کے قدرت میں نہیں ملتا۔ اگر خار سے ڈرتے ہو تو گل، تو بوئے گل کی خواہش چھوڑ دو۔ انجام ریاضت بے اندازہ خوشی ہے جو بالکل عقل و بیان سے باہر ہے۔ کہا بھی ہے ؎

آنکہ واقف گشت بر اسرار ہو　　سرِ مخلوقات چہ بود پیش او
گر تو ایں انبان ز ناں خالی کنی　　پُر ز گوہرہائے اجلالی کنی
آنکہ جاں در روئے او خندد چو قند　　از ترش روئی خلقش بے گزند
آنکہ جاں پیوستہ بر چشم او　　کے خورد غم از فلک و ز خشمِ او

او بعد کچھ عرصہ کے لطف روحانیت حاصل ہونا شروع ہو جاویگا۔

مولٰنا فرماتے ہیں کہ

ہمچو صیادے سوئے اشکار شد　　گام آہو دید و بر آثار شد
چندگاہش گامِ آہو درخور است　　بعد ازاں خود ناف آہو رہبر است

شکاری ہرن کے پاؤں کے نشان کو ہی دیکھ کر چلتا ہے اور بعد میں اُسکو خود ہرن دکھائی پڑتا ہے۔ ویسے ہی ریاضت میں سرورِ اصلی کے احساس کا حال ہے۔ درویش ہرن ہی کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ اُس کے مشک کی خوشبو سے بھی

راحتِ جاں آمدے جاں قوتِ مال مال چوں جمع آمد آنجاں شد وبال

گھر بار۔ بھائی۔ بچہ۔ سیم وزر سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ درویش یہی خیال کرتا ہے
کہ ؎ گھر بناؤں خاک اس آتشکدہ میں ناصحا
آئے جب مرؔ دور مجھکو گورکن یاد آگیا

وہ اپنی ہستی کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ بیوی بچوں کا ترک اُسکے لیے کیا چیز ہے
تُو تجکو اتنا مِٹا کہ تُو نہ رہے
اور تجھ میں دُوئی کی بُو نہ رہے

؎ تہی ز خویش چوں نے شو زپائے تا سرِ خود
وگرنہ بوسہ لب ہائے یار آساں نیست

حرص وہوا تو پہلے ہی اُس سے دُور ہوتے ہیں۔
ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد او ز حرص و عیب کلی پاک شد
دوسروں کو ایذا دینا بدتریں عیب ہے۔ اِس سے سنگدلی کی بنیاد پڑتی ہے۔
اور سنگدلی خداوندی صفات میں شامل نہیں ہے۔ مولنا روم نے اِس سلسلہ
میں فرمایا ہے ؎
رحم خواہی رحم کن بر اشکبار رحم خواہی بر ضعیفاں رحم آر
مسلمانوں کے ظاہری طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ دینِ اسلام میں
رحم کو مقام نہیں ملا ہے شیخ سعدی نے چیونٹی تک کے لئے ایذا رسانی سے منائی

ظاہری ہستی کو فنا کرنا مقصود ہے تاکہ روحانی ہستی قیدِ نفس سے آزاد ہو کر ظاہر ہو جاوے۔ طمع۔ و غذا۔ نفس امارہ کے رکنِ اعظم ہیں۔ ان پر فتح پانی چاہیے عارفان نے فرمایا ہے۔

نیست قُوتِ غیرِ آدم را خورش	از جزآں جاں را نباید پرورش
زیں خورشہا اندک اندک باز بر	کایں غذائے خر بود نے آن خر
تا غذائے اصل را قابل شوی	لقمہائے نور را آکل شوی
چوں خوری یکبار از ماکولِ نُور	خاک ریزی بر سرِ نونِ تنُور
ایں دہاں بستی دہانے باز شد	کو خورندہ لقمہائے راز شد
غم مخور نانِ غم افزایاں مخور	زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر
قند شادی میوۂ باغِ غم است	ایں فرح زخم ست وآں غم مرہم است

اسلیئے

بہر روز مرگ ایں دم مردہ باش	تا شوی با عشق سرِ خواجہ تاش

اور طمع کے لئے ایسا کہتے ہیں۔ کہ

طمع راسہ حرف است وہر سہ تہی

بروزد طمع دیدۂ آدمی

بر تو ہم طمع خوشئ ایں جہاں	شد حجاب آن خوشئ جاوداں
طمع ذوقِ ایں جہانِ پر غرور	از حیات رستنیت کرد دور

نفسانی کے لئے یا طلب پر سیاہی پوتنا ہے۔ اگر تو زبان کا غلام بنا ہوا ہے
تو اپنے اصلی گھر کا مالک کیسے بنے گا؟

بدترین عادت سے رہائی پانے کے بعد پھر طالب حق دیگر دنیاوی خواہشات
کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ایک ایک کرکے انکو اپنے دل میں سے نکال ڈالتا
ہے جیسے کوئی شخص اپنے مکان سے چراغ لیکر چوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر
نکالتا ہے ویسے ہی درویش بھی شمع علم کی روشنی کی مدد سے ایک ایک دنیاوی
خواہش کو اپنے دل سے نکال ڈالتا ہے۔

لقمان کی بابت روایت ہے ایک دن بادشاہ نے اُس سے کہا کہ ہم سے
کچھ مانگ ۔

گفت شاہے شیخ را اندر سخن　　چیزے از بخشش زمن درخواست کن

پھر جو اُن میں سوال و جواب ہوئے وہ حسب ذیل مثنوی میں دیئے ہوئے ہیں

گفت اے شہ شرم نا بد مر ترا　　کہ چنیں گوئی مرا زیں برتر آ

من دو بندہ دارم و ایشاں حقیر　　واں دو بر تو حاکمانند و امیر

گفت شہ آں دو چہ اند ایں ذلت است　　گفت آں یک خشم و دیگر شہوت است

اہلِ دنیا انھیں خشم اور شہوت کے غلام ہیں۔ درویش انکو حلقہ بگوش بنائے
رہتا ہے۔ مذہب کی طرف بھی جب اہلِ دنیا توجہ کرتے ہیں تو فی الحقیقت اسی
وقت جب کسی دنیاوی راحت کی تلاش ہوتی ہے۔ ورنہ کتے کی طرح اُنکی

کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

میازار موئے کہ دانہ کش است　　کہ جاں دارد و جاں شیریں خوش است

فی الحقیقت اسلام میں جانوروں اور انسان کی روحوں میں امتیاز ذاتی صفات کے لحاظ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ اظہار صفات کے لحاظ سے ہی سمجھنا چاہیئے

ایک عورت کی روایت لکھی جاتی ہے کہ اس نے ایک پیاسی بلی کو کنوئیں سے پانی کھینچ کر پلایا جس سے اس کے گناہ کٹ گئے۔

ایک دوسری عورت نے ایک بلی کو باندھ رکھا اور اسکو کھانا پینا کچھ نہیں دیا اور اس طرح سے بھوکوں مرتی وہ مر گئی۔ اس کو بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے

ابو العلی معاری ایک بڑے شاعر و فلاسفر ہوئے ہیں۔ گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔ ہدایت یہ ہے کہ ترک میں سب سے بڑی عادات کو پہلے چھوڑنا ہوتا ہے اور ان میں دوسرے کو ایذا دینا یا مار کر کھا جانا بدترین عادت ہے۔ ؎

روح سے پرد سوئے چرخ بریں　　سوئے آب و گل شد در اسفلیں

جوا۔ شراب خوری۔ شکار۔ جھوٹ بولنا۔ چوری۔ عیاشی بھی ایک دم چھوڑنے پڑتے ہیں۔ ریاضت دل کی صفائی کے لئے کی جاتی ہے۔ جہاں جانداروں کو مار کر انکا گوشت کھا جانا یا جماع وغیرہ عادات موجود ہیں وہاں پاکیزگی اور روحانیت کہاں۔ وہاں فقط زبان کے ذائقہ کے لئے یا کسی دیگر قسم کی لذت

اِسی لئے جو سچے درویش ہیں وہ فراغتِ کُلّی کے حصول کے لئے لنگوٹی بھی اپنے پاس نہیں رکھتے ہیں۔ ابوالقاسم جیلانی کی مانند بالکل برہنہ پھرتے ہیں۔

مولانا روم نے بھی یہی فرمایا ہے

گفت مست اے محتسب بگذار رُو — از برہنہ کے توان بُردن گرو

جامہ پوشاں را نظر بر گازرست — جامہ عریاں را تجلی زیوراست

یا ز عریاناں بیک سو باز رو — یا چوں ایشاں فارغ و بے جامہ شو

مست بولا محتسب کر کام جا — ہوگا کیا ننگے سے تو عہدہ برآ

ہے نظر دھوبی پہ جامہ پوش کی — ہے تجلّی زیورِ عریاں تنی

یا برہنوں سے ہو یکسو واقعی — یا ہو اُنکی طرح بے جامہ اخی

فی الحقیقت تکمیلِ ترک۔ عریانی کے بغیر ناممکن ہے لیکن اُنکے لئے جو ریاضت سے ابھی دُور ہیں ہدایت کم کرنے کی ہے ۔

ور نمی تانی کہ کل عریاں شوی — جامہ کم کن تا رہِ اوسط روی

مطلقاً عریاں جو ہو سکتا نہیں — کپڑے کم کر جاہے ، اوسط کے قریں

درویشِ عریاں کا تمام وقت تصوّرِ روحانیت خود بیں صرف ہوتا ہے۔

دِل چاہتا ہے پھر وہی فرصت ہو رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے ۔

اب وہ اپنی "جان" (روح) کو ہی جاناں جانتا ہے۔ عارضی فانی دنیا دی

زندگی محض نفس پرستی کی ہی زندگی ہوتی ہے۔ درویش اُنکو اسی وجہ سے ننگِ دنیا کے نام سے نامزد کرتے ہیں جیسا کہ ذیل کے درویش اور بادشاہ کے قصّہ سے ظاہر ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک روز ایک بادشاہ ایک درویش کی ملاقات کو گئے۔ مگر اُسکے حُجرے کے دروازے پر پہنچے تو ایک کتّے نے اندر جانے سے روکدیا۔ اِسپر بادشاہ نے زور سے کہا۔

در درویش را درباں نباید

(فقیر کے دروازہ پر چوکیدار کی ضرورت نہیں ہے) فوراً جواب ملا کہ۔

بباید تا سگِ دنیا نہ آید

(ضرورت ہے تاکہ دنیا کے کتّے کو اندر آنے سے روکے)

فقیر اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا ہے۔ دنیاوی۔ دھن۔ دولت تو وہ چھوتا ہی نہیں ہے وہ جانتا ہے۔

وہ مبارک ہے جو بہرِ عشق حال　　　　سب لٹا دیتا ہے گھر اور ملک و مال

وہ کپڑے بھی اپنے تن سے اُتار کر پھینکدیتا ہے اور برہنہ ہو جاتا ہے۔ نجات وہ ہی پا سکتے ہیں جو برہنگی کی فارغ البالی کو پا چکے ہیں۔ جنکے ساتھ ایک ہی خواہش لگی ہوئی ہے وہ اکیلی ہی روحانیت کی آزادی کو حاصل نہیں ہونے دیگی۔ کیونکہ　　"طمع کل دارد ہمیشہ جز ورا"

مگر یہ جان لینا چاہیئے کہ حصول معرفت بھی ہر شخص کو نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ صرف اُس شخص کو ہوگا جس میں بداعتقادی کی ضد اور ہٹ نہیں رہی ہے۔ اور جسکے خوفناک جذبہ ایک حد تک کمزور پڑ گئے ہیں۔ اِسی لئے عارفوں نے کہا ہے کہ ؎

آں را بہ چشم پاک تواں دید چوں ہلال
ہر چشم جلوہ گر بجز آں ماہ پارہ نیست

اعتقاد کے حاصل ہو جانے کے بعد خود اعتقاد اندر ہی اندر سے مخالف جذبوں اور بُری عادات کی جڑ کھوکھلی کر ڈالے گا۔ اور ایک مناسب عرصہ کے بعد دل میں اتنی مضبوطی آجاویگی کہ وہ خود اس امر کا جویاں ہوگا کہ کیونکر باقی ماندہ خرابیوں کو اپنے سے نکال دے۔ اب وہ اِس مسئلے پر عمل کرنے لگے گا کہ ؎

گردش سے روزگار کی ڈر جائے جس کا دِل
انسان ہو کے کم ہے درختوں سے شان میں

مطلب یہ ہے کہ اب وہ آرام و راحت کی زندگی کے بجائے سختی اور تلخی کی زندگی کا طالب ہوگا۔ تاکہ اپنے اُوپر سے مادّی اثرات کو ہٹا دے۔ اِس طرح سے بُری اور کمینہ پن کی عادات کو غارت کرتا ہوا اور اُنکی بجائے نیک خصلات کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہوا وہ ترقی کرتا رہے گا۔ اگر عمل کی

معشوق تو بہت پہلے ہی اسکے دل سے وداع ہو چکے ہیں۔ اب اسکے دو ہی کام باقی ہیں۔ یا تو اپنی باقی ماندہ بدعادات کو چن چن کر غارت کرنا۔ اور یا جانانِ اصلی کے باغ کی شمیم جاں بخش کو سونگھنا۔ یعنی طوطیٔ خوش الحانِ روح کی نغمہ سرائی کو سننا۔ کہا بھی ہے۔

تو مرے ساتھ ہوتا ہے گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

آخر جب مادی غلبہ روح کے اوپر سے ہٹ جاتا ہے تو اس کا پوشیدہ علم ایک دم ہوشیار ہوجاتا ہے۔ اور سالک ہمہ دانی کی روشن ضمیری کو حاصل کرلیتا ہے۔ مگر ابھی جسم اسکے ساتھ چندے اور رہتا ہے۔ بالآخر جب وہ مادی قوت بھی جس پر مدار تدتِ حیات عارضی ہوتا ہے زائل ہوجاتی ہے تو پھر روح ہمیشہ کے لئے قیدِ مادی سے رہائی پاکر اپنی ذاتی خداوندی میں قائم ہوجاتی ہے۔ اور پھر بھی اس سے علیحدہ نہیں ہوتی ہے۔

حدیث میں اس ہی کے بارہ میں فرمایا ہے کہ حق پرست کی موت نہیں ہوتی وہ فانی دنیا سے سیدھا لافانی عالم کو پہنچ جاتا ہے۔

شروع میں تلاش کنندہ کو سالک کہتے ہیں سالک وہ ہے جس کو اصلیت ذات روح کا علم ہوگیا ہے مگر نفس کستی یعنے عمل کی طرف متوجہ ہونے کی طاقت اس میں نہیں ہے۔ مثنوی میں بھی یہی لکھا ہے۔ کہ

اوّلِ فکر آخر آمد در عمل خاص فکرے کو بود وصف ازل

(۵) دنیاوی راحتوں کی کثرت

اِسکے علاوہ اُسکو حصولِ علم میں اپنے کو مشغول رکھنا چاہیئے۔ خیرات۔ نفس کشی وعبادت میں اپنا وقت صرف کرنا چاہیئے۔ ذکر و فکر جسقدر ممکن ہو بڑھانے چاہئیں۔ درویش تو تمام وقت اسی میں صرف کرتا ہے۔ لیکن خانہ دار سے اتنا نہیں ہوسکتا وہ اپنی دنیاوی ضروریات کے ادا کرنے پر مجبور رہے۔ روزگار بھی اُسکو کرنا ہی پڑتا ہے تاہم اُسکی نیت یہی رہتی ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہوسکے وہ راہبرانِ صادق کے نقشِ پا پر چلکر خود راہبر بن جاوے۔ اگر اعتقاد شروع میں حاصل ہوگیا ہے اور راسخ ہے تو ضرور وہ آخری حصۂ عمر میں گھر میں سے نکل کھڑا ہوگا۔ ورنہ یہی سمجھنا چاہیئے کہ اعتقاد ہی کسی غلط بنیاد پر قائم ہوا ہے۔

فقیری اور ٹکڑ گدائی دو چیزیں ہیں۔ فقیر بادشاہ ہے گدا بھاک منگا ہے

فقیری وہی شخص کرسکتا ہے جو

ف سے فاقہ

ق سے قناعت

ی سے یادِ الٰہی یا ذکر

ر سے ریاضت۔

کرنے کے لئے طیار ہو۔ جو موت سے ڈرتا ہو وہ فقیری سے کوسوں دور رہتا ہے سچا فقیر اپنے سب جذبات اور خواہشات کے خلاف جھنڈا لیکر نکل پڑتا ہے

تکمیل کے پہلے موت واقع ہوجائے تو عیشِ جنت ملیگا۔ اور تکمیل ریاضت کے حاصل ہوجانے کے بعد نجات دستیاب ہوسکے گی۔ سالک کو اگر کوئی مرشد کامل ملجاوے تو از ہیں چہ بہتر۔ کیونکہ مرشد کامل کی رہنمائی سے بہت سی دقتیں باسانی سلجھ جاتی ہیں۔ لیکن آجکل کے زمانہ میں مرشد ہی نہیں ملتے ہیں۔ پھر مرشدِ کامل کہاں سے آئیں گے پس پر بھی عارفانِ حق رسیدہ کا اعتقاد یہی ہے کہ

مشکلے نیست کہ آساں نشود
مرد باید کہ ہراساں نشود

ناخنِ غار آکے خود عقدہ ترا کرد بگاوا پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

بہت مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت کے آن پڑنے پر خود بخود دل ہی میں اندر سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم کیا کریں یا کوئی کتاب وغیرہ ملجاتی ہے جس سے دفعیہ کا پتہ چل جاتا ہے۔

ہر خانہ دار کو بھی ذیل کے پانچ گناہوں کے خلاف جہاد کرنا لازمی ہے۔

(۱) مارنا یا ایذا پہنچانا۔

(۲) جھوٹ۔

(۳) چوری۔

(۴) دوسرے کی بہو بیٹی کو تاکنا۔

اور یہ نتیجہ بھی اس تجربہ سے نکلتا ہے کہ مادہ میں روح پر غالب آنیکی قوت نہیں ہے کیونکہ مُنہ میں دبا ہوا پان بھی اپنی موجودگی و قربت کی اطلاع روح کو دینے میں قاصر رہتا ہے۔ روح خود اپنی توجہ کے ذریعے جب مادی ذرات کو اپنے تک کھینچ لاتی ہے تب ہی وہ ذرے اُس تک پہنچ پاتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اب توجہ کے معنی دلچسپی کے ہیں کیونکہ ہم اُس چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں ہم کو دلچسپی ہوتی ہے یعنے جسکے حصول کی ہم کو خواہش ہوتی ہے۔

پس خواہشات ہی باعث بربادی ارواح ہیں۔ اگر اس میں خواہشات بالکل نہ رہیں تو اُس پر مادہ کا اثر کچھ بھی نہ پڑے۔ اِسی لئے نجات کے معنی علمِ معرفت میں قیدِ تن یعنی بندشِ مادہ سے رہائی پاجانا ہے۔

خواہش کے باعث روح میں ایک قسم کی تڑپن و بیتابی پیدا ہوجاتی ہے اور جب خواہشات بند ہوجاتی ہیں تو یہ تڑپن اور بیتابی کم ہوجاتی ہے۔ اور خواہشات کے بالکل غارت ہوجانے پر روح اطمینان و امن کی حالت کو حاصل کر لیتی ہے۔

ریاضت کا اصلی مطلب یہی خواہشات کی بیتابی و تڑپن کا غارت کرنا ہے اگر خواہشات غارت نہوں تو خالی بھوکے رہنے پانی نہ پینے۔ آسن لگانے و نگاہ جمانے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ فی الحقیقت آسن تو درویش کامل ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ جس طرح سے انسانِ کامل کھڑا ہوجاوے وہی آسن ہے

اگر اسکو صاف اور پاکیزہ کھانا کسی نے دیدیا تو لے لیا ورنہ بھوکے مرنے کے ڈر سے اپنے اونچے مقصد یا اصولِ ریاضت کو نہیں گندا کرے گا۔ اب وہ مارنا جھوٹ بولنا وغیرہ پانچوں بڑے گناہوں سے پورے طور سے اپنے کو بچاتا ہے اور اپنے قلب کو جلا دیکر اُجلا بناتا رہتا ہے۔ خواہشات کی جگہ اب وہ فضل روحانی کے لیئے اسکو محفوظ رکھتا ہے اور بالآخر ایک روز درویشی و ہمہ دانی کے خلعت کو زیب تن کر کے ابدی نور پا لیتا ہے۔ یہی تقاضائے دلی ہے۔

ریاضت کے سلسلہ میں یہ بات ضروری ہے کہ قیدِ تن سے رہائی پانے کے لئے دو قوتیں استعمال کیجاتی ہیں۔ اولاً ترک۔ دوئم تصور۔

ترک اِس وجہ سے ضروری اور لازمی ہے کہ خواہشات کے باعث مادی ذرات کی آمد روح تک جاری رہتی ہے۔ دیکھو اگر منہ میں ہمارے پان ہے اور دھیان کہیں اور ہے تو پان کا ذائقہ نہیں آتا ہے۔ ہاں جب دھیان پان کی طرف ہوتا ہے تب اُس کا سواد پورے طور سے آتا ہے۔ اب دونوں حالتوں میں پان تو منہ ہی میں ہے اور اُسکی پیک بھی زبان اور حلق پر سے ہو کر پیٹ ہی میں جاتی رہتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں دھیان اُسکی طرف ہوا اور دوسری میں نہیں ہے۔ بس اس ہی سے ہم جان سکتے ہیں کہ دھیان دینے سے توجہ کے ساتھ ساتھ پان کے ذائقہ کے کچھ لطیف ذرات مادی روح تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور توجہ اُدھر نہ ہو تو یہ لطیف مادی ذرات روح تک نہیں پہنچتے ہیں

ایسا نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ ہمارے گناہوں کا اثر کسی پیر یا بزرگ یا خدا پر پڑتا ہے اور اُس میں معافی حاصل کرنی ہوگی۔ ہمارے گناہ کا اثر ہمارے ہی دل پر پڑتا ہے وہ ہی تنگ و تاریک بن جاتا ہے اور ہماری روحانیت کی کرن کو ماند کر دیتا ہے اِس لیے کہ گناہ میں وہانتک گنجایش ہے کہ جہانتک گنہگار توبہ کی طرف متوجہ ہو سکے۔ ورنہ نہیں۔ اِسی لئے ایک عارف خوش دل نے کہا ہے

؎ ایں درگو ما درگہ نو میدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

برعکس اسکے اگر توبہ توڑنے کے لئے ہی کیجاوے تو وہ خیالِ خام سا ہوگا۔ شرابی اور درویش میں یہی فرق ہے۔ شرابی تو کہتا ہے ؎

سو بار توبہ کیجئے سو بار توڑیئے

مگر درویش کہتا ہے۔

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ توبہ کے بھروسہ پر کیا جاوے کہ پھر توبہ کر لیونگے۔ مولانا رُوم نے فرمایا ہے ؎

ہیں! بہ پشتی آن مکن جرم و گناہ — کہ کنم توبہ در آیم در پناہ
مے بباید تاب و آبے توبہ را — شرط شد برق و سحابے توبہ را
آتش و آبے بباید میوہ را — واجب آمد ابر و برق ایں شیوہ را

جس طرح وہ بیٹھ جاوے وہی ٹھیک ہے۔ نگاہ بھی باہر کی طرف سے ہٹ کر اندر روح کی طرف لگ گئی تو خود ہی یکسو ہو جاویگی۔ اصلی چیز تو ترک خواہشات ہی ہے اگر ترک خواہشات مشکل معلوم ہوتا ہے اور اُس میں دل نہ لگے۔ تو اُسکے لئے تین تدارک ہیں یعنی

(۱) تحصیل علم معرفت

(۲) درویشوں کی یعنی تارکوں کی صحبت

(۳) عالم کی بے ثباتی و جھوٹی تڑک بھڑک کا بچار

آسن، نگاہ بندی، تسبیح وغیرہ سب اِسی لئے ہیں کہ باہری دنیا کی طرف سے توجہ کو ہٹاویں۔ شروع شروع میں حسب ضرورت سالک کو اُنکی مدد لینی ہی پڑتی ہے مگر اصلی چیز ترک خواہشات ہے۔

جتنی جتنی تڑپن روح کی کم ہوتی جاویگی اُتنا اُتنا ہی امن روح کو ملتا رہے گا اور انجام کار سرور جاودانی بھی چشمۂ ذاتِ خاص سے دستیاب ہو جاوے گا۔

ایک مرتبہ دل کی تڑپن اور بیتابی کے کلیتاً دُور ہو جانے پر پھر یہ نئے سرے سے پیدا نہیں ہو سکتی ہیں۔ اِس لئے نجات کی خوشی جاودانی سرور کہلاتا ہے۔ اگر ریاضت میں خلل واقع ہو جاوے یا مصمم ارادے شکست ہو جاویں تو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ فوراً توبہ کرکے از سر نو اپنے ارادے کو مصمم بنالینا چاہیئے

خاربن در قوت و برخاستن (۲۱۳) خارکن در سستی و در کاستن

خاربن ہر روز و ہر دم سبز و تر (۲۱۴) خارکن ہر روز زار و خشک تر

او جواں تر مے شود تو پیر تر (۲۱۵) زود باش و روزگار خود مبر

خاربن دان ہر یکے خوئے بدت (۲۱۶) بارہا در پائے خار آخر زدت

بارہا از فعل بد نادم شدی (۲۱۷) بر سر راہ ندامت آمدی

وقت کسی کے روکے نہیں رکتا ہے۔ زمانہ برابر تیز رفتار سے نکلا چلا جا رہا ہے ہوشمندی سے کام لے توقف کا وقت نہیں ہے۔

سال بیگہ گشت وقت کشت نہ (۲۱۸) جز سیہ روئی و فعل زشت نہ

کرم در بیخ درخت تن فتاد (۲۱۹) بایدش برکند و بر آتش نہاد

ہیں اوہیں اے راہ رو بیگاہ شد (۲۲۰) آفتاب عمر سوئے چاہ شد

ایں دو روزک را کہ زورت ہست زود (۲۲۱) پیر افشانی بکن از راہ جود

اینقدر تخمیکہ ماندستت بکار (۲۲۲) تا در آخر بینی او را برگ و بار

دنیا دار کی زندگی کا نقشہ ذیل کے اشعار میں مولنا روم نے کھینچا ہے۔

گہ خیال خرچہ و گاہے دکاں (۲۲۳) گہ خیال علم و گاہے خان و ماں

گہ خیال کسب و سوداگری (۲۲۴) گہ خیال تاجری و داوری

گہ خیال نقرہ و فرزند و زن (۲۲۵) گہ خیال بو الفضول و بو الحزن

گہ خیال کالہ و گاہے قماش (۲۲۶) گہ خیال مفرش و گاہے فراش

تا نباشد برقِ دل، آبِ دو چشم (۲۰۸) کے نشیند آتشِ تہدید و خشم
تا نباشد گریۂ ابر از مطر (۲۰۹) تا نباشد خندۂ برق اے پسر
کے بروید سبزہ و ذوق وصال (۲۱۰) کے بجوشد چشمہا ز آبِ زلال
پس توبہ اُسی وقت کامیاب ہوگی جب ابرِ دلِ غمگین سے چشمۂ چشم پشیمانی کے آنسو برسائے۔ ورنہ نہیں۔

جتنا توقف ترک خواہشات و توبہ میں ہوگا اُتنی ہی بُری عادات کی جڑ مضبوط ہوتی جاویگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ خداوندی روح اُسکی ذاتی صفت ہی ہے اور اس لئے کتنا ہی رذیل انسان کیوں نہو اُسکو بھی مایوسی کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن جتنی زیادہ سیاہی آئینۂ قلب پر چڑھ جائیگی۔ اُتنی ہی زیادہ دقّت اُسکے اُتارنے میں اُٹھانی پڑیگی۔ اور بعض صورتوں میں تو دلی سیاہی قلب کو ہی روشنی طبع سمجھ بیٹھے گا۔ جبکہ کوئی چارۂ کار ہی نہ مِل سکے گا۔

اِسی لئے درویشانِ خداشناس نے فرمایا ہے کہ توقف کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے طالبِ حق کو اور کاموں کو چھوڑکر تلاشِ نجات میں لگ جانا چاہیئے ؎

تو کہ میگوئی کہ فردا ایں بداں (۲۱۱) کہ بہر روزے کہ مے آید زماں
آں درخت بد جواں تر میشود (۲۱۲) ویں کنندہ پیر و مضطر میشود

رہتا ہے۔ اسے ہی استحکام اعتقاد سمجھنا چاہیئے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سالک کو اپنے دل پر قدرے قابو ملجاتا ہے تو وہ خود ترک خواہشاتِ نفسانی کا خواستگار ہوجاتا ہے۔ پھر جب خواہشیں اور بھی مر جاتی ہیں تو وہ تصور تین طرح سے ہوتا ہے۔ من سے یا زبان سے اور یا جسم کی مدد سے

(۱) من سے تصور کرنے میں شکل خداوندی کو من میں قائم کرتے ہیں انسانِ کامل کی ہی شبیہ فی الحقیقت شکل خداوندی ہے۔ اُسی کے مبارک چہرہ کو جس میں سرورِ جاودانی جھلک رہا ہے دھیان میں قائم کرتے ہیں۔ یہ شبیہ خود آزادی فرخندگی وحیات جاودانی کی شکل ہے اور دوسروں کو اپنی طرح بنا دیتی ہے سالک اسکو دھیان میں جاکر خود ویسا ہی ہوجاتا ہے۔

(۲) الفاظ کے ذریعہ خود اپنی ہی روح کی ستایش کیجاتی ہے اور اسکی خداوندی کا تکرار کے ساتھ اظہار کیا جاتا ہے۔

(۳) جسم کے ذریعے سے بھی کسی جگہ مثلاً آنکھوں میں یا ناک کے سرے پر یا ناف کے یا دل کے مقام پر توجہ لگاکر روح کے وجود کا احساس کیا جاتا ہے۔

شروع میں یہ تینوں ذرائع بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن آخر میں تیسرا ذریعہ قائم ہوجاتا ہے اور جب روح جسمِ خاکی اور مادی تعلق سے بالکل آزاد ہوجاتی ہے تب وہ خالص نور کے اندر رہجاتی ہے۔ مادّی جسم کے سانچہ میں جو شکل اُسکی تھی ویسا ہی اُس کا نقشہ رہجاتا ہے۔ مگر اب یہ شکل بزرگی اور کمال روحانیت کے

گہ خیالِ میغ و ملغ و لیغ و لاغ (۲۲۷) گہ خیالِ آسیا و باغ و راغ

گہ خیالِ نامھا و ننگھا (۲۲۸) گہ خیالِ آتشی و جنگھا

ہدایت مناسب یہی ہے کہ

ہین بروب از دل چنیں تبدیلہا (۲۲۹) ہیں ابروں کن از سرایں تخییلہا

از زباں تنہا نہ بل از عین جان (۲۳۰) ہاں بگو لا حولہا اندر زماں

اب تصوّر کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اِس میں شروع میں ذکر و فکر و ستائیش سے بہت مدد ملتی ہے۔ ذکر کا مفہوم اسمارِ الٰہی کا جو صفات روحانیت کے اظہار کرنے والے ہیں بار بار کہنا۔ اِس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اُن صفات پر فکر یعنے بچار کیا جاوے جیسے سب اصلی اسمارِ الٰہی فی الواقع روح کی ہی صفات ہیں۔ اِس لئے اُن پر بچار کرنے سے حصولِ علمِ روحانیت مقصود ہے اور ستائیش کا یہی آخری مدعا بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ستائیش بھی کسی دوسرے کی نہیں ہے صرف اپنی ہی ہے۔ مگر جبتک علم و یقین یعنے اعتقاد کی کمزوری رہتی ہے اُس وقت تک سالک اُن ارواحِ پاک کی ستائیش کرتا ہے جو اُس سے پیشتر اُسی راہ سے گذر کر منزلِ مقصود تک پہنچ چکے ہیں۔ یعنی اُنکی جو درجہ خداوندی کو پہنچ گئے ہیں۔ اِس سے اطمینان اور اعتقاد کی مضبوطی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں فلاں اصحاب جو ہمارے ہی جیسے انسان ضعیف البیان تھے خدا سے واصل ہو گئے ہیں تو ہم کو اپنی روح کی صفاتِ ذاتی میں شبہ نہیں

الواقع کسی کے دل میں نہیں آتا ہے۔ یوں ماننے کو توکوئی چاہے جو بات مان لے کسی کی شکل کو تصور میں دیکھ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ اس طرح پر تو چاہے جسکی شکل تصور میں قائم کیجا سکتی ہے۔ خواب میں توہمکو ایک دنیا کی دنیا ہی دکھائی دیتی ہے جو محض خیال کی مصوری کا نمونہ ہے۔ پاگل آدمیوں کو بھی طرح طرح کی اشکال نظر آیا کرتی ہیں اور وہ بالکل اصلی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر واقعی وہاں کچھ تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ اِس لئے طالب نجات کو اِس قسم کی شعبدہ بازی سے علیحدہ ہی رہنا چاہیئے اور بھول میں پڑکر مدعائے اصلی کو نہیں کھودینا چاہئے بلا شک وشبہ جو شکل تصور میں قائم کرنے کے قابل ہے وہ خداوندی یعنی انسان کامل کی شکل ہے۔ یہ شکل خوشی اور روحانیت کا مظہر ہے۔ اطمینان ویقین کا مرکز ہے بغض وغم۔ و رغبت۔ و نفرت سے مبرّہ ہے تلون فراجی۔ اور چھچھورے پن سے دور ہے۔ اسکے دیکھنے سے آنکھوں کو سکھ اور قلب کو تسکین ملتی ہے۔ دل کی کمزوری یقین کی قوت میں بدل جاتی ہے۔ روحانیت کا نشہ دل میں بھرجاتا ہے اور پاکیزگی۔ صفائی کی طرف رغبت بڑھتی ہے۔ نفس امارہ کی جڑیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں۔ بالآخر اس شکل کو ہماری روح کو بھی ایک دن قبول کرنا ہوگا۔ اسلئے یہ شکل فی الواقع قابل تصور ہے۔ اِسی شکل الٰہی کا عشق ہے جو رندوں کے دل کو پیارا ہے۔ اِسی کی مستی ہے جس کے وہ مست ہیں ؎

تو بہر مستی ولا غرہ مشو (۲۳۱) ہست عیسٰی مست حق خرمست جو

باعث مثل آفتاب کے درخشاں ہوتی ہے۔ اور محبت اور نفرت کے جذبات سے
پاک ہونے سے نہایت باامن اور نہایت درجے کی بشاشی کا اظہار کرنے والی
ہوتی ہے۔ غضب۔ غصہ۔ مکر و فریب بالکل اس میں نمایاں نہیں ہوتے ہیں۔
اور یہ ہمیشہ اسی حالت میں رہتی ہے۔ اسی کا نام نجات ہے۔ اس میں اب نہ کسی قسم
کی خواہشات یا خواہشات کی تڑپن باقی رہتی ہے اور نہ پھر کبھی یہ خواہشات کے
پھندے میں پھنس ہی سکتی ہے۔
عارفانِ ذیشان کا قول ہے کہ جس نے ذرا دیر کو بھی دل سے دنیا کو چھوڑ دیا
اُسکو اصلی خوشی کا حال معلوم ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ جیسا کہا بھی ہے کہ

ایک دو دن کیا ہے دنیا ایک گھڑی
جسنے چھوڑی اُسکو راحت مل گئی

اِس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کسقدر راحت آزادگانِ کامل کو جنہوں نے دنیا اور
مادی جسم دونوں سے فراغت پائی ہے حاصل ہوتی ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ فقیر
ترک و ریاضت کی سختیوں کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ کیونکہ اس تھوڑی
سی دقت کا پھل بے اندازہ خوشی ہمیشہ کی زندگی و کمالِ علم ہیں۔
کچھ نیم واقفکاران کا خیال ہے کہ معمولی پیروں کی شکل پر بھی تصوّر کرنا چاہیئے
یہ لوگ پیر کی شکل سے نظر آنے کو پیر کا ہی دل میں آنا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ قطعاً غلط
ہے۔ الغزالی نے اسکی تشریح کردی ہے کہ معمولی پیر تو درکنار خود بانی دین بھی فی

ہستی انسان میں فی الواقع تریاق و زہر دونوں موجود ہیں۔ غافل انسان زہر کو ہی رات دن زہر مار کرتے رہتے ہیں۔ مگر تریاق اُنکے واسطے ہمیشہ مہیا ہے اور زہر کی نسبت نزدیک تر ہے کیونکہ خداوندی تو شروع کی صفت ہی ہے

گویدت تریاق از خود جو سپر (۲۴۱) کہ ز زہرم من ترا نزدیک تر

زہر خواہشات دیکھنے میں خوشگوار اور ذائقہ میں اولاً میٹھا معلوم پڑتا ہے مگر تاثیر میں برعکس مزاج رکھتا ہے۔ تریاق برعکس اس کے مشکل سے دستیاب ہوتا ہے اور شروع میں تلخ محسوس ہوتا ہے مگر؂

تو ز تلخی چونکہ دل پُر خوں شوی (۲۴۲) پس ز تلخیہا ہمہ بیروں روی

الغرض ظاہری ہستی کو کلیتاً نیست و نابود جس نے کر دیا وہی حیات جاودانی کا مستحق ہوتا ہے اور کوئی نہیں مثنوی میں آیا ہے کہ؂

ہم چنیں جویائے درگاہِ خدا (۲۴۳) چوں خدا آید شود جویندہ لا

گرچہ آں وصلت بقا اندر بقاست (۲۴۴) لیک ز اول بقا اندر فناست

سایہ ہائے کہ بود جویائے نور (۲۴۵) نیست گردد چوں کند نورش ظہور

کیونکہ۔

سایہ و عاشقی بر آفتاب (۲۴۶) شمس آید سایہ گردد لا شتاب

ظاہری اور روحانی ہستی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کا فروغ دوسرے کے زوال کا باعث ہے۔ اس لئے حیاتِ ابدی کے طالبوں کو جسمانی ہستی

این چنیں مے رانجور زین غینہا (۲۳۲) مستیش نبود ز کوتہ دیہا

زانکہ ہر معشوق چوں خینست پر (۲۳۳) آں یکے دُرد و دگر صافی چو دُر

مے شناسا ہیں بجیش با احتیاط (۲۳۴) تا مئے یابی منزہ و ز اختلاط

شراب معرفت وہ شراب ہے کہ جس سے دِل میں عقل کل کی ضیاء بیمثال پڑنے لگتی ہے۔ دِل شیشہ کی طرح صاف و بے زنگ ہو جاتا ہے کیونکہ

مہ جماد است و بود شرقش جماد (۲۳۵) جان جانِ جاں بود شرقش فواد
دل

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ۔

ہمچنانکہ قدر تن از جاں بود (۲۳۶) قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود

گر مدے جان نہ ندھبے پر تو کنوں (۲۳۷) ہیچ گفتے کافراں رآمیتوں

مگر دل کی صفائی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خواہشات کا زنگ اِس پر خوب گہرا چڑھا ہوا ہے اِس کا دھونا سخت کام ہے۔ کڑوے گھونٹوں کے پیالے پینے پڑتے ہیں اِس لئے صبر ضروری ہے۔ کیونکہ

ہر کہ او اندر بلا صابر نہ شد (۲۳۸) مقبل ایں در گہ قاصر نہ شد

اولاً ایمان کی دنیا میں جنم لینا چاہیئے۔ جب یہ ولادت ثانی حاصل ہو گئی تو پھر سب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ مثنوی میں فرمایا ہے کہ

مرد اوّل بستۂ خواب و خوراست (۲۳۹) آخر الامر از ملائک برتر است

چوں دوم بار آدمی زادہ بزاد (۲۴۰) پائے خود بر فرق علتہا نہاد

باب دہم

خالق

درویشوں نے کبھی اپنی رُوح کے سوا کسی دوسرے کو خدا یا خالق نہیں مانا۔ بلکہ زاہد کو ہمیشہ گم گشتہ بتایا یہی کہا کہ ؎

زاہدِ گم گشتہ کا مجھ رند سے اتنا ہے فرق
وہ کہے اللہ ہو۔ اور میں کہوں اللہ ہُوں

فی الحقیقت اُنھوں نے عوام کے مانے ہوئے خالق سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ خود اپنے کو خالق خدا فرمایا ؎

مَیں نے مانا دہر کو حق نے کیا پیدا و لے
مَیں وہ خالق ہوں مرے کُن سے خدا پیدا ہوا

ایک اور اہلِ ذوق کا کلام ہے کہ ؎

"من آنوقت بُودم کہ آدم نبود"
من آنوقت کردم خدا را سجُود (۲۵۰) کہ ذات وصفاتِ خدا ہم نبود

اِس کا مطلب بالکل صاف ہی۔ صرف چشمِ بینا کی ضرورت ہے۔ روح جب تک ناپاکی تن سے علیحدہ نہیں ہوتی اُس وقت تک باوجود اسکے کہ اپنی ذات میں خداوندی صفات سے متصف ہو خدا نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ مولنٰا حضرت فریدالدین

کی بیخ کنی کرنی پڑتی ہے معمولی انسان کو تو اس ذاتی روحانیت کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ جس کی ہونہار اچھی ہوتی ہے اُنکے دل میں ایمان کی روشنی چمکنے لگتی ہے اور پھر مے عشق کی قوت سے حصارِ نفس شکستہ ہو جاتا ہے

چوں بعنبر ایدئے توفیق را (۲۴۷) قوت مے بشکند ابریق را

الغرض جان یعنی روح خود ہی سب سے بڑا معجزہ کر ڈالتی ہے کہ

جان جملہ معجزات این است خود (۲۴۸) کہ بخشد مردہ را جانِ ابد

یہ واضح رہے کہ حصول نجات میں مرد و عورت کا امتیاز نہیں ہے ارواح سب ذاتی ہیئت میں ایکساں ہیں مگر فرق صرف مزاج کے باعث ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں بدیوں کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ راہِ معرفت میں اُن کا مزاج ایک حد تک حارج ہوتا ہے اِس لئے مثنوی میں آیا ہے کہ

فضل مرداں برزناں حالی بپرست (۲۴۹) زاں بود کہ مرد پایاں بیں ترست

عورت برہنگی اختیار نہیں کر سکتی ہے۔ مرد کر سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ عورت کو نجات نہ ملیگی۔ صرف مطلب اتنا ہی ہے کہ جامہ زن سے نجات نہیں ملتی ہے۔ عورت آیندہ جامۂ مرد میں پیدا ہو کر نجات حاصل کر سکتی ہے۔

━━━━ (✤) ━━━━

محروم ہے۔ قیدِ تن سے رہائی پاتے ہی خدا ہو جاتی ہے۔ پس جس نے اسکو جسم کے قید خانہ میں ڈالا وہ اس کا دوست نہیں بلکہ سخت سے سخت دشمن ہی ہو سکتا ہے۔ مولنا فرماتے ہیں

ذِلَّۃُ الاَرْوَاحِ مِنْ اَشْبَاحِھَا   عِزَّۃُ الاَشْبَاحِ مِنْ اَرْوَاحِھَا

روح کی ذلت ہے اُسکے جسم سے   رُوح سے بڑھتے ہیں رُتبے جسم کے

اور یہ بھی نہیں ہے کہ کسی بیرونی خالق سے کچھ فائدہ روح کو کسی قسم کا ہو سکے کیونکہ باہر سے جو چیز بھی کوئی ہم کو دے گا وہ ہم تک محض حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہی پہنچ سکے گی اور خواہشات کو بھڑکانے والی ہی ہوگی۔ اِس لئے دنیاوی نعمتوں کو بھی ہمکو ترک ہی کرنا ہے۔ چاہے وہ اِس جہان کی ہوں اور چاہے جنت کی ہوں۔ اِس لئے کوئی بیرونی خدا کوئی لینے قابل چیز بھی ہم کو باہر سے نہیں دے سکتا۔ بلکہ فی الحقیقت تو وہ ہمکو ہماری ذاتی خداوندی صفات سے ہی اپنی نعمتوں سے پھسلا کر محروم رکھے گا۔

اور یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ کوئی خدا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو ارواح کو ایذا پہنچانے یا جہنم میں ڈالنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ خداوندی روحانیت کے کمال کا نام ہے نہ کہ خونخواری و ایذا دہی کی قابلیت کا۔ روحانیت میں۔ ترک۔ رحم فراغت جیسے صفات شامل ہیں نہ کہ خونخواری۔ غضب وغیرہ۔

اِسی لئے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ

عطار نے فرمایا ہے کہ

تاتو ہستی خدائے درخواب است (۲۵۱) تو نمانی چو او شود بیدار

جب روح تن کی ناپاکی سے علیٰحدہ ہو جاتی ہے خود خدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خدا تو خود تھی ہی صرف کثافتِ مادی سے محدود تھی۔ اسی وجہ سے خدا نہ تھی اب وہ محدودیت دُور ہو گئی اور کمالیت کلی حاصل ہو گئی۔ اسی لئے انسانِ کامل اپنے کو خالق خدا کہنے میں تامل نہیں کرتا ۔ وہ جانتا ہے کہ اُسکی ہی کوشش سے خدا کا اظہار ہوا ہے اِس لئے وہی خالق خدا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو صفاتِ خداوندی میں خلقت شامل نہیں ہے۔ کیونکہ فراغت اور مصروفیت دو مخالف چیزیں ہیں۔ جہاں فراغت یعنی احساس آزادی ہے وہاں مصروفیت و کارگذاری کے لئے گنجایش ہی نہیں ہے اور جہاں مصروفیت ہے وہاں راحت فراغت و آزادی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔

اور رُوح تو خود خدا بھی کہا جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک رُوح تو خالق ہو اور دیگر ارواح مخلوق۔ ایک قسم کی اشیا میں جو ایک حالت ہے وہی فراتی صفات کے لحاظ سے دوسرے کی بھی لازمی ہو گی۔

اور جسم کا خالق بھی اگر ہم کسی کو مان لیویں تو وہ بجائے مہربان دوست اور مربی و سرپرست ہونے کے سخت سے سخت دشمن ہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ رُوح تو خود اپنی ذات میں خدا ہے یہ تو صرف قید تن کی وجہ سے اپنی خداوندی سے

ضرور پکڑ گئی کہ اُنکے سامنے زبان کھولنا ناممکن ہوگیا۔ اسی لئے درویش اور فلاسفر کو معرفت نے پوشیدہ رموز کا طریقہ قائم کیا۔ جن کو وہ قابل اعتبار اور آزمودہ لوگوں پر ظاہر کرتے تھے۔ آج پھر خوبی قسمت سے وہ زمانہ آگیا ہے کہ اب پوشیدہ تعلیم کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اگر اس موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھایا جاویگا تو اندیشہ ہے کہ بچا کھچا علم معرفت بھی برباد ہوجائے۔ اس لئے افشائے راز کیا جاتا ہے جن لوگوں نے اِن اشعاروں وتمثیلات کی تشریح پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ کیسی کیسی نازک خیالیوں سے کام لیا گیا ہے۔ قابلیت اس میں سمجھی جاتی ہے کہ بندشِ خیال دھوکہ دیدے۔ جتنا دھوکہ زیادہ دیا جاوے اُتنی عمدگی مانی جاتی تھی۔ گلشنِ راز۔ مثنوی مولانا روم وغیرہ کتب انہیں رموز خفیہ کا اشارتاً انکشاف کرتی ہیں۔ علانیہ کہنے کی جرأت بہت کم لوگ قدیم زمانہ میں رکھتے تھے پھر بھی افشائے راز کی کوشش لازمی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چند باشی عشق با نقش سبو (۲۵۳) بگذر از نقش سبو و آب جو

چند باشی عاشق صورت بگو (۲۵۴) طالب معنی شو و معنے بجو

صورتش دیدی زمعنی غافلی (۲۵۵) از صدف دُر را گزیں گر عاقلی

یونست در بطنِ ماہی پختہ شد (۲۵۶) مخلصش را نیست از تسبیح بد

گر فراموشت شد آں تسبیح جاں (۲۵۷) بشنو ایں تسبیحہائے ماہیاں

ایں جہاں دریا و تن ماہی و روح (۲۵۸) یونس محجوب از نور صبوح

دہ درویشاں گلیمے بخسپند
(۲۵۲)
و دو شاہاں در اقلیمے نگنجند

اسکے علاوہ روح کو پکڑ کے باندھنا و دیگر طرح سے دق کرنا بھی اُس وقت تک ممکن ہے جبتک اُسکے ساتھ جسم مادّی لگا ہوا ہے۔ بعد میں تو نہ وہ دیکھی جاتی ہے نہ چھوئی جاسکتی ہے نہ پکڑی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ روح جب مادی قید سے آزاد ہو جاتی ہے تو اُس وقت اُسکو ذاتی سرور اسقدر بہتایت کے ساتھ حاصل ہوتا ہے کہ اگر اُسکو کوئی پکڑ کر جہنم میں ڈال بھی سکے تو اُس کا کچھ بھی نہ بگڑے۔

یہ عوام کی غلطی ہے کہ خداوندی صفات میں خلقت کی صفت شامل ہوگئی ورنہ ماہرانِ راز نے کبھی ایسا نہیں مانا۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں تمثیلات کا بہت رواج چل پڑا تھا۔ اُس زمانہ میں خواہشات کو شاعرانہ بندش خیال میں شیطان باندھا تھا اور رُوح کو خدا۔ اور اس باعث سے کہ ہر رُوح خود اپنی ہی طبیعت کی بنانے والی ہے اور جسم خاکی کی ساخت کا باعث بھی اُس کی ہی زبردست قوتیں ہوتی ہیں جو اعضائے جسمانی کے بنانے میں کارکن ہوتی ہیں۔ اِس لئے خالق کا خطاب بھی روح کے لئے موزوں ہوا۔ جب تمثیلات کا مفہوم مفقود ہوگیا۔ تب عوام نے ایک دنیا کے پیدا کرنے والے اور سزا و جزا کے دینے والے خدا و خالق کو قائم کردیا۔ اور جہالت گزشتہ زمانے میں اسقدر قوت

اس کا مطلب یہی ہے کہ اس جسم کا بنانے والا جسم ہی میں پوشیدہ ہے اُس میں ہی جب تو ڈھونڈے گا تو عیاں ہو جاویگا۔ ایسے خدا کے لئے گائے کے خوں یا اُسکے تڑپنے و جانکنی کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ قربانی تمثیل میں نفس کشی کی ہدایت کرتی ہے۔ قرآن میں اُونٹ کی قربانی کے بارہ میں بھی یہی لکھا ہے کہ وہ ایک علامتی قربانی ہے ورنہ خدا کو اُس کا خون و گوشت و پوست پسند نہیں ہے۔ گائے کی قربانی کا تذکرہ یہودیوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے مگر methodeina جسکے زمانے کو قریب ۱۷۰۰ سال ہوئے اُسکے معنے تمثیلی بتاتا ہے اور نفس کشی کے مفہوم میں اُس کا بیان کرتا ہے۔

مولنا روم نے بھی گاؤ کی قربانی کا مطلب مثنوی میں بتایا ہے آپنے فرمایا ہے کہ

تا ز زخم لخت یابم من حیات چوں قتیل از گاؤ موسیٰ اے ثقات

تا ز زخم لخت گاوے خوش شوم ہمچو کشتہ گاوِ موسیٰ گش شوم

زندہ شد کشتہ ز زخم دم گاؤ ہمچو مس زر میشود از سیمیا

کشتہ برجست و بگفت اسرار را وانمود از زمرۂ خونخوار را

گفت روشن ایں حجابت گشتہ اند تخم ایں آشوب ایشاں کشتہ اند

چونکہ کشتہ گشت ایں جسم گراں زندہ گردد ہستی اسرار داں

جانِ او بیند بہشت و نار را باز داند جملۂ اسرار را

گاؤ کشتن ہست از شرط طریق تا شود از زخم دمش جان شفیق

گر مسبح باشد از ماہی رہید (۲۵۹) ورنہ در دوے ہضم گشت و ناپدید
آتش ابراہیم را نبود زیاں (۲۶۰) ہر کہ نمرودیست گوئی ترس ازاں
نفس نمرود ست و عقل و جاں خلیل (۲۶۱) رُوح در عین ست و نفس آمد دلیل

یہاں پر اشارتاً دو افسانوں کا راز کھول دیا ہے تاکہ عاقل سمجھ لے کہ کس سے کیا مطلب ہے۔ عوام کے لئے یہ اشارہ ناکافی ہے۔ مگر ان تمثیلات کو معمولی کلیلہ ومنہ کے قصہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ان میں رموز روحانی پوشیدہ رکھے گئے ہیں جو انسان کے لئے نہایت کارآمد ہیں۔

بہت سے رازِ تمثیلیہ Studies in Tasawwuf نامی کتاب میں مولوی خواجہ خان نے درج کئے ہیں۔ اور یہی سباق ان رموز کو ظاہر کرتے ہیں۔ انکی ناواقفیت سے لوگوں نے بہت دھوکہ کھایا ہے اور بجائے نفع کے نقصان اُٹھایا ہے۔

ایسا ہی ایک رازِ تمثیلی قربانی گاؤ کا ہے جس کا اصلی منشا و مفہوم نفس کشی کا تھا مگر اب لوگ اسکو اُلٹا سمجھے ہیں اور اس خیال سے کہ اُن کا خدا گائے نامی جانور کی قربانی سے خوش ہو کر اُنکے ساتھ نیک سلوک کریگا اس کا خون بہاتے ہیں۔ مگر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ علم معرفت کسی بیرونی خدا کو نہیں مانتا ہے وہ تو پکار پکار کر یہی بار بار کہتا ہے کہ ؎

کارکُن در کارگہ باشد نہاں (۲۶۲) تو برو در کارگہ بینش عیاں
کار چوں بر کارکن پردہ تنید (۲۶۳) خارج آں کار نتوانیش دید

اس کا مطلب یہی ہے کہ اس جسم کا بنانے والا جسم ہی میں پوشیدہ ہے اُس میں ہی
جب تو ڈھونڈے گا تو عیاں ہو جاویگا۔ ایسے خدا کے لئے گائے کے خوں یا
اُسکے تڑپنے و جانکنی کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ قربانی
تمثیل میں نفس کشی کی ہدایت کرتی ہے۔ قرآن میں اُونٹ کی قربانی کے بارہ میں بھی
یہی لکھا ہے کہ وہ ایک علامتی قربانی ہے ورنہ خدا کو اُس کا خون و گوشت و پوست
پسند نہیں ہے۔ گائے کی قربانی کا تذکرہ یہودیوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے
مگر methodeina جسکے زمانے کو قریب ۷۰۰ سال ہوئے اُسکے معنے تمثیلی
بتاتا ہے اور نفس کشی کے مفہوم میں اُس کا بیان کرتا ہے۔

مولنا روم نے بھی گاؤ کی قربانی کا مطلب مثنوی میں بتایا ہے آپنے فرمایا ہے کہ

تا ز زخم لخت یابم من حیات　　چوں قتیل از گاؤ موسیٰ اے ثقات
تا ز زخم لخت گاوے خوش شوم　　ہمچو کشتہ گاؤ موسیٰ کش شوم
زندہ شد کشتہ ز زخم دم گاؤ　　ہمچو مس زر میشود از سیمیا
کشتہ بر جست و بگفت اسرار را　　وانمود از زمرۂ خونخوار را
گفت روشن ایں حجابت کشتہ اند　　تخم ایں آشوب الشان کشتہ اند
چونکہ کشتہ گشت ایں جسم گراں　　زندہ گردد ہستی اسرار داں
جان او بیند بہشت و نار را　　باز داند جملۂ اسرار را
گاؤ کشتن ہست از شرط طریق　　تا شود از زخم دمش جان شفیق

گر بسنج باشد از ماہی رہید (۲۵۹) ورنہ در دے ہضم گشت و ناپدید
آتش ابراہیم را نبود زیاں (۲۶۰) ہرکہ نمرودیست گو ئی ترس ازاں
نفس نمرودست و عقل و جاں خلیل (۲۶۱) رُوح در عین ست و نفس آمد دلیل

یہاں پر اشارتاً دو افسانوں کا راز کھولدیا ہے تاکہ عاقل سمجھ لے کہ کس سے کیا مطلب ہے۔ عوام کے لئے یہ اشارہ ناکافی ہے۔ مگر ان تمثیلات کو معمولی کلیلہ و منہ کے قصہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ان میں رموز روحانی پوشیدہ رکھے گئے ہیں جو انسان کے لئے نہایت کار آمد ہیں۔

بہت سے راز تمثیلی Studies in Tasawwuf نامی کتاب میں مولوی خواجہ خان نے درج کئے ہیں۔ اور یہی سباق ان رموز کو ظاہر کرتے ہیں۔ انکی ناواقفیت سے لوگوں نے بہت دھوکہ کھایا ہے اور بجائے نفع کے نقصان اُٹھایا ہے۔

ایسا ہی ایک راز تمثیلی قربانی گاؤ کا ہے جس کا اصلی منشا و مفہوم نفس کشی کا تھا مگر اب لوگ اسکو اُلٹا سمجھے ہیں اور اس خیال سے کہ اُن کا خدا گائے نامی جانور کی قربانی سے خوش ہو کر اُنکے ساتھ نیک سلوک کریگا اُس کا خون بہاتے ہیں۔ مگر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ علم معرفت کسی بیرونی خدا کو نہیں مانتا ہے وہ تو پکار پکار کر یہی بار بار کہتا ہے کہ ؎

کارکن در کارگہ باشد نہاں (۲۶۲) تو برو در کارگہ بینش عیاں
کار چوں بر کارکن پردہ تنید (۲۶۳) خارج آں کار نتوانیش دید

پس عید الضحیٰ وہی مناتے ہیں جو اپنے نفس کی قربانی چڑھاتے ہیں۔ گائے نامی جانور کی قربانی تو جذبۂ رحمت کے خلاف ہے اور روحانیت کے حصول میں حارج ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں نفسِ امارہ کی قربانی ایک ایسی قربانی ہے جس میں تمام دنیا خوشی سے شریک ہو سکتی ہے اور ہو گی۔ یاد رہے کہ بغیر قربانی مناسب کے وہ خدا جسکو ایک بڑے ماہر رازِ معرفتِ الٰہی یعنے فرید الدین عطار نے سویا ہوا بتایا ہے نہیں جاگ سکتا ہے۔

تا تو ہستی خدا اے در خواب ہست — تو نہ مانی چو او شود بیدار

اِس کو اُردو میں یوں کہنا چاہیئے ؎

تری ہستی ہے باعث اُس خدا کے خواب غفلت کی
رہے جب تو نہ عالم میں تو وہ بیدار ہو جاوے

ظاہر ہے وہ "تو" کے غارت ہونے کے بغیر یہ سویا ہوا خدا بیدار نہیں ہو سکتا ہے اِس ظاہری "تو" کا ہی تو سر کاٹنا ہے۔

جب نفس کُشی میں کامیابی ہو جاتی ہے تب

در زمانِ عدلش آہو با پلنگ (۲۶۴) اُنس بگرفت و بروں آمد ز جنگ
شد کبوتر ایمن از چنگالِ باز (۲۶۵) گوسفند از گرگ ناورد احتراز

اِسی قسم کی اور قربانیاں بھی سمجھنی چاہئیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ دنیا میں مذہب کے نام سے لوگوں میں لڑائی جھگڑے پائے جاتے ہیں وہ انہیں تمثیلات کی وجہ سے ہیں۔ اب لوگوں کو اِن تمثیلات کا مفہوم معلوم نہیں۔ اِس وجہ سے آپس

گاوِ نفس خویش را از وے بکُش تا شود روحِ خفی زندہ بہش

اِن کا ترجمہ بزبانِ اُردو حسب ذیل ہے۔

زندگی مجھ کو بھی وہ حاصل ہو جو گاؤ موسیٰ سے ملی مقتول کو
زخم لختِ گاؤ سے ہوں شادماں مثلِ کشتہ۔ گاؤ کا قاتل ہُوں ہاں
کُشتہ زندہ تازیانہ سے ہوا جیسے مس کو زر بنا دے کیمیا
کُشتہ اُٹھا بھید سب ظاہر کیئے قاتلوں کے نام اُس نے دیئے
یعنی مارا اس جماعت نے مجھے بیج اِنہوں نے بوئے ہیں آشوب کے
جبکہ مرجاتا ہے یہ جسم گراں جاگتی ہے ہستی اسرار واں
دیکھتی ہے جاں بہشت و نار کو اور سمجھتی ہے تمام اسرار کو
مارنا ہے گائے کا شرط طریق تا ہو اُسکے زخم دم سے جاں شفیق
مار ڈال اِس اپنی گاؤ نفس کو تاکہ تیری روح پنہاں زندہ ہو

مطلب یہ ہے کہ روح نفس پرستی کی بدولت تنِ خاکی کی قید میں ہے نفس کو مار ڈالا جائے تو روح رہائی پاکر درجۂ خداوندی کو پالے اور اُس وقت اُسپر سب پوشیدہ اُمور ظاہر ہو جاویں سا اور بہشت و دوزخ میں جواب محدودیت کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی ہیں اُس وقت محدودیت کے غارت ہو جانیسے صاف نظر آنے لگیں۔ یعنی روح ہمہ داں یا غیر محدُود علم سے متصف ہو جاوے اِس نفس کی گائے کی قربانی ہے جو فی الواقع ہر مسلمان پر فرض ہے۔

وحدت کے صرف یہی معنی ہیں کہ ذاتِ خداوندی روح میں کسی دوسرے خدا کو شامل نہ کرنا۔ کیونکہ اگر تم نے کسی دوسرے اصلی یا فرضی خدا کو اس کا مربی یا سرپرست مان لیا تو تم ٹکڑوں کی گداگری سے کبھی نہیں چھوٹو گے۔ جملہ صفاتِ الٰہی خود روح میں موجود ہیں پھر وہ تم کو کوئی دوسرا خدا یا خداوند کیسے دے سکتا ہے تمہیں تو خود اپنی ہی مفرد (یعنی واحد) ذات پر اعتقاد دلانا ہے۔ تب ہی اندرونی نورانیت تمہاری ہستی میں ضیا فگن ہو سکیگی۔ اسی لئے مولنا روم نے فرمایا ہے۔

منگر اے مظلوم سوئے آسماں (۲۷۲) کاسمائے شاہ داری در زماں
زاں نہادم از ممالک مذہبے (۲۷۳) تا نیابد بر فلکہا یا ربے

ایک اور عارف کا قول بھی پیش ہے۔

اے خلق بحج رفتہ کجائید کجائید (۲۷۴) معشوق ہمیں جاست بیائید بیائید
معشوق تو ہمسایۂ دیوار بدیوار (۲۷۵) در بادیہ سرگشتہ چرائید چرائید

فی الحقیقت جب روح خود اپنی وحدانیت میں قائم بالذات ہے تو دوسرے کی وحدت سے کیا سروکار۔ مولانا کہتے ہیں کہ

چوں بروز ندہ شدی آں خود ویست (۲۷۶) وحدت محض ست آں شرکت کیست

یہ ایسی وحدانیت وخداوندی ہے کہ جس میں کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مولنا فرماتے ہیں کہ

پیشِ سلطاں خوش نشستہ در قبول (۲۷۷) جہل باشد جستن نام و رسول

ہیں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اگر ان کا مفہوم معلوم ہو جائے تو ایک ساتھ مل کر جشن
منایا کریں۔ مولانا نے فرمایا ہے۔
اختلاف خلق از نام اوفتاد (۲۶۶) چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد
انہیں جھگڑوں کے باعث گذشتہ زمانہ میں سمجھدار لوگ اپنے عقائد کا اظہار
کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اگر کہیں کسی ناخلف بدذات نے سن لیا تو جان
کی بھی خیر نہ تھی۔ چنانچہ خود مولانا روم نے بھی اس ہدایت کو دوہرایا ہے ؎
در بیاباں ایں سہ کم جنباں لبت از ذہاب و از ذہب و ز مذہبت
(تین باتوں کو چھپا ممکن ہو گر مذہب و راہ سفر اور مال و زر)
بڑے سے بڑے عارفوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ناخلف و ناشناس کے
سامنے اپنی زبان کھولیں۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ
گر بگویم آنچہ دارم در دروں (۲۶۷) پس جگر ہا گردد اندر تاں خون
صرف اشارہ ہی سے کلام ہوا کرتا تھا جیسا کہ ہمنے اُوپر بتایا ہے اور بھی اسکی تائید
میں ذیل کے اشعار درج کرتے ہیں ؎
تو ز قرآں اے پسر ظاہر مبیں (۲۶۸) غیر آدم را نہ بیند غیر طیں
ظاہر قرآن چوں شخص آدمیست (۲۶۹) کہ نقوشش ظاہر و جانش خفی ست
ہزلہا گویند در افسانہا (۲۷۰) گنج میجو در ہمہ ویرانہا
اے دریغ آں دیدہ کور و کبود (۲۷۱) آفتاب اندر او ذرہ نمود

ہوتے ہیں اور جنھوں نے راہِ راست کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ اُنہیں کی تصویر تصور کے لئے۔ اُنہیں کا کلام ہدایت کے لئے۔ اُنہیں کے طریقے عمل کے لئے مفید ہو سکتے ہیں معمولی درویشوں کی صحبت بھی اُنکی واقفیت کی قدر کے اندازہ کے مطابق مفید ہوتی ہے مگر ہر شخص مرشد نہیں ہو سکتا ہے۔ امتحان کی ضرورت ہے نیک و بد کو سمجھ کر کام کرنا چاہیئے۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جو صفات مرشد میں نہیں ہیں وہ کبھی بھی مرید میں اُسکے ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتی ہیں۔ اُسکی مثل تو وہی ہوگی کہ دیگراں را نصیحت و خود را فضیحت۔ ہدایت میں اُسی مرشد کی اثر ہو سکتا ہے جو خود اپنی ہدایت پر عمل کرتا ہے۔ اُسی کے عمل کا سکّہ سالکوں کے دلوں پر جم سکے گا دوسروں کے علم و عمل کا نہیں۔ جیتے جی مُردہ بن جانا تو کسی طرح ایسے آدمی کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے جو خود زندگی کے مزے لے رہا ہے اُنکے لئے یہ شعر نہیں کہا گیا ہے کہ ؎

شکر کُن مر شاکراں را بندہ باش (۲۸۷) پیشِ ایشاں مردہ شو پایندہ باش

جسنے خود اپنے کو جلا کر خاکستر کر لیا ہے وُہی اپنے لئے اور دوسروں کے لئے اکسیر بن جاتا ہے اُس کے لئے ہر شخص کی خواہش ہے کہ

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند (۲۸۸) آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

مرشدِ کامل کی زیرِ نگرانی رستہ طے کر کے ہم جلد منزلِ مقصود پر پہنچ سکیں گے بشرطیکہ ہم توہماتِ فاسد سے اپنے دِل کو پاک رکھیں اور کسی فرضی خدا یا خداوند

صرف شروع میں رہبر کی ضرورت ہوتی ہے مگر رہبر ایسا ہونا چاہیئے جسنے خود منزل مقصود کو پالیا ہے۔ ایسے بہت سے انسان ہو چکے ہیں جو حیات ابدی علم کل۔ سرور جاودانی کو پاکر خداوندی درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اِس وقت عرش فلاک پر اپنی ذاتی صفات کا حظ لے لے کر محظوظ ہوتے ہیں۔ اُنکی خوشی بے اندازہ ہے۔ اُنکا علم غیر محدود ہے۔ اُنکی زندگی افزونی کی صفت سے متصف ہے۔ مثنوی میں مولٰنا نے فرمایا ہے کہ ؎

بس کسانے کز جہاں بگذشتہ اند (۲۷۸) لا نیند و در صفات آغشتہ اند

در صفاتِ حق صفاتِ جملہ شاں (۲۷۹) ہمچو اختر پیشِ آں خور بے نشاں

گر ز قرآں نقل خواہی اے حروں (۲۸۰) خواں جَمِیْعٌ هُمْ لَدَیْنَا مُحْضَرُوْن

مُحْضَرُوْن معدوم نبود نیک بیں (۲۸۱) تا بقائے روحہا داری یقین

اِسی لئے مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

رُوحِ خود را متصل کن اے فلاں (۲۸۲) زود با ارواحِ قدسِ سالکان

گر نخواہی ہر دمے ایں خفت و خیز (۲۸۳) کن ز خاک پائے مردے چشم تیز

کحل دیدہ ساز خاکِ پاش را (۲۸۴) تا بیندازی سر اوباش را

ایں طلسم سحر نفس اندر شکن (۲۸۵) سوئے گنج پیر کامل نقب زن

شکر کن مرشاکراں را بندہ باش (۲۸۶) پیش ایشاں مردہ شو پائندہ باش

دراصل ایسے ہی کاملوں کے نقش پا پر چلنے سے فائدہ ہو سکتا ہے جو گمراہ نہیں

وستایش کرتا ہے تاکہ قوتِ اعتقاد اپنا پھل دکھائے اور فی الواقع ایک دن روح نفس امارہ کو غارت کرنے کی قابلیت حاصل کرلے ✤
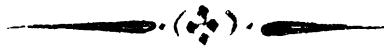
کی اطاعت وحمد وثنا میں اپنا وقت رائگاں نہ کھوویں۔ بلکہ اُنہیں اصلی خدا اور رب کی ہر وقت خوشنودی کے باعث رہیں۔ اسلئے ہر وقت ہم کو اپنی روح کی صفات الٰہی کی ہی ستایش کرنا ہوگی۔ اُسی کا شکر وسپاس ادا کرنا ہوگا۔ اسی سے ہماری ہستی ہے۔ اسی کی نور وضیا سے ہماری عقل اپنا ٹمٹماتا ہوا چراغ جلاتی ہے اسی کے باعث سے ہماری خوشی ونیک بختی ہے۔ جو کچھ عمدگی وشرف ہم کو حاصل ہوا ہے یا ہوگا وہ اسی کی ذات بابرکات کی بدولت ہے اور ہوگا۔ اسی کا شکر اسی کا ذکر اسی کی فکر اس لئے ہمارے اُوپر واجب ولازم ہے۔ نمازِ پنجگانہ اِسی کی خاطر ادا کی جاتی ہے۔ جتنی بدبختی وبدنصیبی ومصیبت ہم کو ملتی ہے وہ سب نفس امارہ کی بدولت ہے۔ یہی زبردست خفیہ ہمارا دشمن ہے جو ہمارے خمیر میں گھس بیٹھا ہے۔ اسی منحوس کی شومی قدم کے باعث ہم پر وبالِ مادی آن پڑا ہے جسم ہی ہماری اصلی صفات کے اظہار میں حارج ہوتا ہے۔ یہی ساحرِ نفس کا قلعہ ہے۔ یہی ہمارے جانی دشمن نفس امارہ کا دوست اور ہمارا سخت دشمن ہے۔

عارفانِ حق نے ہمیشہ تنِ خاکی کو مخالف روح کا مانا ہے۔ جاہل لوگ ہی ایسا خیال کرتے ہیں کہ اس کا کوئی بیرونی بنانے والا ہے جس کا ہمکو احسان ماننا چاہیئے۔ اُنکی نگاہ میں تنِ خاکی قابلِ قدر چیز ہے۔ مگر عارف جانتا ہے کہ اصلیت معاملہ دگرگوں ہے۔ تن روح کے لئے باعثِ ذلت ہے اور اُسکی تخریب وتباہی کا آلہ ہے۔ اِس سے مخلصی پانا عین نجات ہے۔ پس وہ اپنی روح ہی کی تعریف و

اندرون تست آں طوطی نہاں | عکس اورا دیدہ تو بر این وآں

(دایا طوطی وحی ہے جسکی صدا | ہے ازل سے پہلے جسکی ابتدا

جسم میں تیرے وہ طوطی ہے نہاں | اس پر اس پر عکس ہے اس کا عیاں)

مولنا روم کا درجہ اسلامی دنیا میں بہت بڑا ہے۔ مثنوی بعد قرآن اور حدیث کے تیسرے نمبر پر درجے کے لحاظ سے آتی ہے۔ لیکن مولانا روم کے علاوہ بھی متعدد فلاسفران اسلام نے آواگون کو مانا ہے۔ اِن میں سے ایک شخص ابو مسلم خراسانی ہوئے ہیں۔ احمد ابن ثابت بھی آواگون کے قائل تھے درویشوں نے بھی علانیہ تناسخ کی تعلیم دی ہے۔ بکتاشی فرقہ کے درویش اِس مسئلہ کو مانتے تھے۔ اِن کا اعتقاد تھا کہ انسان بدافعالی سے حیوانات میں بھی جنم لے سکتا ہے۔

روح تذکیر و تانیث کے جھگڑوں سے علیحدہ ہے مولنا روم نے فرمایا ہے

لیک از تجنیس او رابا ک نیست | روح را با مرد و زن اشتراک نیست

(جان کو تجنیس سے ہو باک کیا | مرد و زن سے روح کا اشتراک کیا؟)

مگر جیسے جذبہ اُلفت پیدا کرتی ہے اُنہیں کے بموجب یہ تذکیر و تانیث کی علامت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اِس لئے ایک ہی روح کبھی مرد اور کبھی عورت کے طور پر مجسّم ہوتی ہے۔

تناسخ میں کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔ اگر تناسخ نہ ہو کام ہی ادھورا رہ

باب یازدہم

تناسخ الارواح

آجکل تناسخ کا مسئلہ اہلِ اسلام کو ناپسندیدہ ہے لیکن مولنا روم نے فرمایا ہی

پیش ازیں تن عمرہا بگذاشتند (۲۸۹) پیشتر از کشت بر بر داشتند

اِس کا یہی مطلب ہی کہ روح نے پیشتر بھی تخمِ اعمال بوئے ہیں اور پھل کھائے ہیں
اِس سلسلے سے تعلق رکھنے والے مثنوی کے مشہورتر اشعار حسب ذیل ہیں۔

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام (۲۹۰) ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

از جمادی مردم و نامی شدم (۲۹۱) وز نما مردم بحیوان سر زدم

مردم از حیوانی و آدم شدم (۲۹۲) پس چہ ترسم کہ ز مردم کم شوم

حملہ دیگر بمیرم از بشر (۲۹۳) تا برآرم از ملائک بال و پر

بار دیگر از ملک پرّاں شوم (۲۹۴) آنچہ اندر وہم نایہ زاں شوم

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں (۲۹۵) گویدم اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

اِن میں صاف طور سے رُوح کا سلسلہ وار جمادات و نباتات و حیوانات میں
سے گذر کر انسانی جامہ پانے کا مضمون بھرا ہوا ہے۔ روح کی ابتدا کوئی نہیں
ہے۔ حیات ابدی ہے اور ابتدا کی ابتدا سے بھی پیشتر سے ہے ؎

طوطئ کاید ز وحی آوازِ او پیش ز آغاز وجود آغاز او

از بنی بشنو ضلالِ رهرواں (۲۹۶) که چناں کرد آں بلیس بدرواں
صد ہزاراں سالہ را از راہِ دُور (۲۹۷) بر دشاں و کرد شاں زاد یا رعور

تناسخ کا مسئلہ بہت دقیق راز ہے۔ اسکے سمجھنے کے لئے اعمال کا فلسفہ پہلے جاننا پڑتا ہے یہ اُن دقیق مسائل میں سے ہے جنکے لئے کہا گیا ہے ؎

شرحِ ایں در آئینہ اعمال جو (۲۹۸) کہ نیابی فہم ایں از گفتگو

جب بچہ حمل میں آتا ہے تو وہ خونِ مادر کو اپنی غذا بناتا ہے اور اُسے جذب کر کے اپنے اعضا بناتا ہے ؎

برمثالِ عنکبوت آں زشت خو ۔۔۔ پردہ ہائے گندہ را برجا فداو
(وہ تو مکڑی کی طرح نا آشنا ۔۔۔ پردے خود ہے اپنے اُوپر تانتا)

بنانے والی طاقتیں روح کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ پاک روح جو مادہ کے میل سے بالکل بری ہے وہ درجۂ خداوندی رکھنے کے باعث پھر کبھی قیدِ تن میں گرفتار نہیں ہو سکتی ہے صرف ناپاک روح ہی جس کے ساتھ نفسِ امارہ لگا ہوا ہے گردشِ فلک کا شکار رہتی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

از کدامی بند مے جوئی خلاص (۲۹۹) وز کدامی قید مے خواہی مناص
بندِ تقدیر و قضائے مختفی (۳۰۰) ہاں نہ بیند آں بجز ذاتِ صفی
گرچہ پیدا نیست آں در مکمنت (۳۰۱) بدتر از زندان و بند آہن ست
زانکہ آہن گر مر آں را بشکند (۳۰۲) حفرہ گر ہم خشت زنداں بر کند

جائے - روح تو ایک دائمی ہستی ہے اِس کا تو ناش ہو ہی نہیں سکتا ہے - پھر اگر اِس نے نجات نہیں پائی تو اس کا کیا ہوگا ؟ اور کیا ہمیشہ کو اسکی ذاتی خداوندی اپنا اظہار کبھی نہیں کر پاویگی ؟

یہ اُن لوگوں کی بات نہیں ہے جو غفلت و جہالت کی تاریکی میں مبتلا ہیں بلکہ اُن کا ذکر ہے جو نفس کشی میں مصروف ہیں اور راسخ الاعتقاد بھی ہیں - اگر وہ پُورے طور سے نفس کشی میں کامیاب نہونے پائے تو اُنکا کیا ہوگا ؟ اگر اِس ہستی کے بعد اور کوئی ہستی ہی نہیں ہوگی تو پھر وہ کہاں کے رہیں گے ؟

قیامت تو ایک تمثیلی استعارہ ہے - چنانچہ خان صاحب نے اپنی سٹڈیز ان تصوّف* میں اس کا مفہوم یہ تبلایا ہے کہ قیامت اُسوقت ہوگی جب انسان خدا کی صفات دستیاب کرلیگا - یعنی روح کا مُردہ پن کی حالت سے جاگ اُٹھنا اور خداوندی کو پالینا ہی قیامت ہے -

پس یہ ظاہر ہے کہ راسخ الاعتقاد کو متواتر موقع ملتے رہیں گے تاکہ وہ اپنے کو کامل بنا سکے اور جب وہ انسان کامل یعنی خدا کے درجہ کو پہنچ جائیگا تب ہی اسکی قیامت ہوگی اِسی کا نام آواگون یا تناسخ ہے - جو نجات کی راہ سے بھٹک کر پھر نفس امارہ کا شکار بن جاتے ہیں وہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برسوں تک گرداب آواگون میں گھومتے پھرتے ہیں - مثنوی میں آیا ہے کہ ؎

---

* Studies in Tasawwuf

ایسا فرمایا ہے ؎

چونکہ ایماں بردہ باشی زندہٗ (۳۰۶) چونکہ با ایماں روی پایندہٗ

اسی مسئلہ کی تشریح و وضاحت کرتے ہوئے مولنا روم فرماتے ہیں ؎

آمدہ اول باقلیم جماد (۳۰۷) وز نباتے از جمادی اوفتاد

سالہا اندر نباتے عمر کرد (۳۰۸) وز جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتے چوں بحیواں اوفتاد (۳۰۹) نایدش حال نباتی ہیچ یاد

باز از حیواں سوئے انسانیش (۳۱۰) میکشد آں خالقے کہ دانیش

ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت (۳۱۱) تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

انسانی جامہ پاکر بہتیرے تو ایسے ہیں کہ وہ تاریکی جہالت سے نکلنے ہی نہیں پاتے ہیں۔ بعض گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اور دشمن دین و ایمان بنجاتے ہیں اور پھر حیوانی جامہ پہنتے ہیں یا اس سے بھی خراب حالت کو پہنچتے ہیں۔ مولنا روم لکھتے ہیں کہ

اے دریدہ پوستین یوسفاں (۳۱۲) گرگ برخیزی ازیں خواب گراں

فی الحقیقت

خمر تنہا نیست سرمستی و ہوش (۳۱۳) ہر چہ شہوانی است بندد چشم و گوش

ترک شہوت کن اگر خواہی تو ہوش (۳۱۴) زانکہ شہوت باز بندد چشم و گوش

جو ارواح گرداب تناسخ سے ایک مرتبہ نکل جاتی ہیں وہ پھر دوبارہ اس میں

ایں عجب ایں بند پنہان گراں (۳۰۳) عاجز از تکسیر آں آہن گراں

فی الحقیقت یہ وہ بند ہیں جو لوہے سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔ کسی دوسرے کے توڑنے سے یہ ٹوٹ نہیں سکتے ہیں۔ ہر روح کو خود ہی توڑنے پڑتے ہیں۔ انہیں بندوں کا نتیجہ ہے کہ روح مادی کششوں کے زیر اثر ہے اور خود شکم مادر میں اپنا جسم بناتی ہے جیسا کہ کہا ہے ؎

از خورش او جذب اجزا میکند (۳۰۴) تار و پود جسم خود را می تنند

یہ بند خواہشات نفسانی کی قوتیں ہیں۔ جن کا مجموعی کام نفس امارہ ہے۔ دوران زندگی میں خواہشات میں قدرتاً تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں بعض زبردست خواہشات کمزور اور کمزور خواہشات زبردست ہو جاتی ہیں۔ موت کے وقت خواہشات کا پوتھا یعنی نفس امارہ روح کے ساتھ جاتا ہے اور نئے جسم کی ساخت میں حصہ لیتا ہے۔ اس طرح پر جب تک یہ بیخ و بنیاد سے نہیں اکھاڑ پھینکا جاتا ہے یہ روح کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر ایک جسم سے دوسرے جسم میں لیجاتا ہے۔ اسی کا نام تناسخ ہے۔ مگر جب نفس امارہ بالکل غارت ہو جاتا ہے تو پھر روح کشش مادی کے تابع نہیں رہتی ہے اور نجات پالیتی ہے۔ اسلئے صاحب فہم موت کا خوف نہیں کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ

لیک ہر چہ فوت شد غمگیں مشو (۳۰۵) آنکہ گر شد کہنہ آید باز نو

اور جن کو نور ایمان حاصل ہو گیا ہے جو در اصل نفس امارہ کا خلع ہے اُن کو

باب دوازدہم

قربانی گاؤ

گائے کی قربانی کی ایک روایت ہے۔ اِس مسئلہ کا تذکرہ ہم پیشتر کرچکے ہیں اور بتاچکے ہیں کہ وہ نفس امارہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گائے یا کسی اور جانور کی قربانی سے مطلب نہیں ہے بلکہ نفس کا مارنا ہی اِس کا مدعا ہے۔ مولانا روم کے کچھ اشعار بھی اس سلسلہ میں ہم پہلے دیچکے ہیں۔ لیکن چونکہ گاؤ کی قربانی کی روایت کا مفہوم نہایت پر معنی ہے اِس لئے اسکو علیحدہ اِس باب میں پیش کیا جاویگا۔

مثنوی میں ایک خواجہ زادہ کا قصہ دیا ہوا ہے جس نے روزی بیرنج کے لئے دعا مانگی۔ یہ دعا اُسکی منظور ہوگئی اور ایک روز اُسکے مکان میں ایک گائے اُسکے دروازے کو توڑکر فوراً گھس آئی جس کو اُسنے روزی بے رنج سمجھ کر مار کر کھالیا اسکے بعد ایک شخص اپنے تئیں اُس گائے کا مالک قرار دیتا ہے۔ اُس خواجہ زادہ کو قاضی کے سامنے لے گیا اور اُس سے معاوضہ کا طلبگار ہوا۔ قاضی کو الہام کے ذریعہ سب حال معلوم ہوگیا کہ دراصل وہ گائے اُس خواجہ زادہ کی ہی تھی اُسکے پدر کو مار کر اُس گائے کا مالک اُس کا نوکر بن بیٹھا تھا اور اب مدعی بن کر خواجہ زادہ کو ستانا چاہتا تھا۔ اِسکی تعبیر اِن الفاظ میں مولٰنا نے فرمائی ہے ؎

نہیں پڑتی ہیں۔ اِس کو مثنوی میں دو غیر جنس پرندوں کی تمثیل میں صاف کردیا ہے۔ ایک پرندہ روح ہے۔ اور دوسرا جسم مادی اور مادے کا اختلاط ہے۔ روح کہتی ہے کہ

حق مرا چوں از پلیدی پاک داشت | چوں سزد بر من پلیدی را گماشت
گندگی سے پاک حق نے جب رکھا | مجھ سے پھر ناپاک کا ہو میل کیا

یک رگم زیشاں بد و آں را برید | در من آں بد رگ کجا خواہد رسید
اُنکی اک رگ مجھ میں تھی وہ کاٹ دی | مجھ میں اب کس طرح بد رگ آئے گی

یہ بد رگ نفس ہی ہے جو ایک مرتبہ کٹ جانے کے بعد پھر پیدا نہیں ہوسکتا اصلیت یہ ہے کہ مادہ روح پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتا ہے صرف اُسوقت اُسکی قوت کارگر ہوتی ہے جب روح خود اپنی خواہش سے اسکی صحبت کی متلاشی ہو۔ دیکھو منہ میں دبا ہوا پان بھی اپنی یاد اُسی وقت روح کو دلا سکتا ہے جب ہم اسکی طرف متوجہ ہوں۔ اگر من کسی اور طرف لگا ہوا ہے تو پان کو چبانے رہنے پر بھی اُس کی موجودگی کی خبر تک نہیں ہو گی۔ اِس لئے جو ارواح نفس کو بالکل غارت کر چکی ہیں وہ پھر قید میں نہ آئینگی۔

روزی بے رنج کیا ہے اے فنا — رونق نوری اور روحانی غذا
گائے کی قربانی میں ہے منحصر — گائے میں ہے گنج ای جویائے زر

درحقیقت تنِ خاکی جبلی خواجہ ہے جو نفس کی بچھیا کا اپنے کو مالک قرار دیتا ہے لیکن وہ اصل خواجہ زادہ نہیں ہے۔ کہا بھی ہے ؎

اگر تن را نباشد دل منور زیر خاکش کن — نباشد در شبستان عزتِ فانوس خالی را

اصل خواجہ زادہ روح ہی ہے جو روزی بے رنج یعنی سرورِ جاودانی کی تلاش میں ہے یہ سرور جاودانی عقلِ کل کے ساتھ قید نفس میں ہے پس نفس کی موت کے بغیر اُس کا چھوٹنا نہیں ہو سکتا ہے۔ اِس لئے گائے کی قربانی ہر مسلمان پر لازم آتی ہے ؎

گوئی اللہ اکبر وایں شوم را (۲۱۶) سر ببر تا وارہد جاں از عنا
معنی تکبیر این است اے امیم (۲۱۷) کاے خدا پیش تو ما قربان شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر می کنی (۲۱۸) ہم چنیں در ذبح نفس کشتنی

تکبیر کا واقعی مفہوم یہ ہے کہ نفس کشی اُسی وقت کار آمد ہوتی ہے جب روح پاک کے نام پر کیجائے یعنی جب نجات ابدی ہی وجہ ترک ہو ورنہ ریاضت محض تکلیف جسمانی کا ہی درجہ رکھتی ہے دنیاوی اغراض کے لئے بھی تو نفس امارہ کو تھوڑا بہت مارنا ہی پڑتا ہے لیکن اس سے روحانیت کے حصول سے کوئی تعلق نہیں ہے پس نفس کشی اُسی وقت فائدہ مند ہوگی جب اللہ یعنی روحانیت اعلیٰ سے اُس کا تعلق ہو۔ ورنہ نہیں۔ وہ روایت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس طرح پر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص مر گیا اور اُس نے ایک یتیم اور ایک بچھیا کو چھوڑا۔ یہ بچھیا یتیم کے بالغ ہونے تک صحراؤں اور بیابانوں میں چرتی پھری۔ جب یہ یتیم بالغ ہوا تو اسکی ماں نے اُس سے کہا کہ یہ بچھیا تیری ہے تو اسکو لیجا کر بازار میں تین اشرفیوں کو بیچ آ۔ نوجوان بچھیا

نفس خود را کش حیاتے زندہ کن
خواجہ را کشتہ است او را بندہ کن

تدعی گاؤ نفس تست ہیں
خویشتن را خواجہ کردست و مہیں

آں کشندہ گاؤ عقل تست رو
بر کشندہ گاؤ تن منکر مشو

عقل اسیر ستت ہمی خواہد ز حق
روزی بے رنج و نعمت بر طبق

روزی بے رنج او موقوف چیست
آنکہ بکشند گاؤ را کاصل بد یست

نفس گوید چونکہ کشتن گاؤ من
زانکہ گاؤ نفس باشد نقش تن

خواجہ زادہ عقل ماند بے نوا
نفس خونی خواجہ گشت و پیشوا

روزیٔ بے رنج میدانی کہ چیست
قوت ارواح است و ارزاق نبیت

لیک موقوف است بر قربان گاؤ
گنج اندر گاؤ داں اے گنج گاؤ

اِن اشعار کا اُردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

نفس کو مار اپنے دنیا کو جِلا
قاتلِ خواجہ ہے بندہ سے بنا

نفس تیرا مدعی ہے گائے کا
اور لیا ہے آپ کو خواجہ بنا

عقل نے تیری ہے مارا گائے کو
تو کشندہ گاؤ سے منکر نہ ہو

عقل قیدی ہے۔ ہے حق سے مانگتی
روزی بے رنج اور نعمت کھلی

روزی بے رنج کیا ہے اے اخی
گائے کا مرنا جو ہے اصل بدی

گائے ماری نفس کرتا ہے سخن
گائے کیا ہے نفس کیا یعنی تن

خواجہ زادہ عقل ہے بس بے نوا
نفس خونی خواجہ بن بیٹھا ترا

اِس خداوندی کا نہ ہونا ہی اُسکی موت کہا ہے۔ روح کی خداوندی مُردہ ہونے پر روح مثل ایک یتیم کے ہے جس کا والی وارث کوئی نہیں ہے۔ مگر جسکے ساتھ نفس امارہ کی بچھیا وابستہ ہے۔ ابتدا میں جب تک روح عالم جمادات و نباتات و حیوانات میں گشت تناسخ میں گھومتی ہے اُس وقت تک اِس بچھیا نفس کو بجز گھاس پھوس و تنکے وغیرہ کے اور کوئی عمدہ خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ انسانی جامہ پا جاتی ہے تو باغ عدن میں رکھی جاتی ہے تمثیل کی عبارت میں اسی بات کو اس طرح پر بیان کیا ہے کہ یتیم کے بالغ ہونے تک اُسکی بچھیا صحرا اور ریگستانوں میں چرتی رہی۔

بالغ ہونے پر یعنی انسانی جامہ پانے پر اُسکو عقل بھی دستیاب ہو جاتی ہے جسکو تمثیل میں یتیم کی ماں بیان کیا ہے۔ اب آگے کا حال کہتے ہیں۔

انسان کی ضروریات کے تین پیمانہ ہوتے ہیں۔

(۱) سب سے اول تو یہی فکر ہوتی ہے کہ بھوکوں مرنے سے بچے اور کسی کسی طرح سے پیٹ کا پالن کرے۔

(۲) جب پیٹ پالن کا انتظام ہو جاتا ہے تو اب یہ فکر اسے ہوتی ہے کہ خانہ داری کا سکھ بھی ملے۔ اب یہ شادی کی فکر کرتا ہے۔ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُنکی صحبت میں یہ خوش رہتا ہے۔

(۳) پھر جب یہ سب مہیا ہو گیا تب اُسکی خواہش فراہمی سامان عیش و عشرت

لیکر بازار میں گیا۔ وہاں اسکو ایک فرشتہ بشکل انسانی ملا۔ اس فرشتہ نے
یتیم کی بچھیا کے چھ اشرفی دام لگائے۔ مگر یتیم اپنی ماں سے پوچھنے کو گھر گیا۔
کہ بیچ دے یا نہیں۔ ماں نے اجازت دیدی۔ مگر اب جب یتیم چھ اشرفیوں کے
عوض بچھیا کو بیچنے کے لئے تیار ہوگیا تو فرشتہ نے اسکے بارہ اشرفی دام لگائے
یتیم نے پھر بھی اپنی ماں سے مشورہ کیا۔ ماں نے کہا کہ یہ تو آدمی نہیں۔ بلکہ کوئی
فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اس بچھیا کی تقدیر کا حال دریافت کرنا چاہیئے
پوچھنے پر فرشتہ نے کہا کہ اس بچھیا کی ضرورت یہودی لوگوں کو پڑے گی اور اسکو
تم سے خرید لیوینگے۔ چنانچہ ایک یہودی اپنے ایک عزیز قریب کے ہاتھ سے مارا گیا
اور قتل ایسے دور دراز مقام پر ہوا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں لگ سکا۔ اور نہ نعش ہی
ملی مقتول کے کچھ دوستوں نے کچھ لوگوں پر موسیٰ کے سامنے الزام لگایا کہ ہمارا
شبہ ان پر ہے کہ انہوں نے مقتول کو قتل کیا ہے۔ ملزمان نے اقبالِ جرم
نہیں کیا اور کوئی شہادت تھی ہی نہیں۔ اس وقت ہدایت الٰہی ہوئی کہ خاص
خاص علامات والی ایک گائے قربان کرکے مردہ کے جسم کو ذبیحہ سے چھوادیا
جائے چنانچہ ایسا کیا گیا۔ مردہ ایسا کرتے ہی جی اٹھا اور اسنے اپنے قاتلوں کا نام
بتایا اور پھر جسم وہیں گر پڑا۔

یہ روایت گائے کی قربانی کی ہے۔ اسکی تعبیر حسب ذیل ہے۔

تن میں مقید ہونے کی وجہ سے روح کی خداوندی مُردہ یعنی ضایع ہوجاتی ہے۔

چھ اشرفیوں کا مطلب یہی ہے کہ تین یہاں کی اور تین وہاں کی ذرا طبیعت کو مارنے سے اس دنیا میں فارغ البالی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ ذرا اور قاعدہ قرینہ سے ترک خواہشات کریں۔ عاقبت یعنی بہشت وغیرہ کا سکھ بھی مل سکتا ہے یہی مفہوم فرشتہ کے چھ اشرفیوں کے مول کا ہے۔ اور بارہ اشرفیوں کا مطلب سرور جاودانی نجات کا ہے جو تین اور چھ دونوں سے بہت زیادہ افزوں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر جڑ مول سے ہی نفس امارہ کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے تو روح نجات و درجہ خداوندی کو پاکر سرور جاودانی کو حاصل کرتی ہے۔

اب ہم روایت کے دوسرے حصہ کی تعبیر لکھتے ہیں۔ ایک یہودی اپنے ایک عزیز قریب کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسمانیت اور روحانیت دونوں کا رشتہ بوجہ تعلق جسم کے بہت قریب ہے اس لئے روح اور جسمانی ہستی ایک دوسرے کے عزیز قریبی ہوئے۔ معمولی انسان صرف اپنی جسمانی ہستی کو ہستی مانتا ہے۔ روح کا اسکو علم ہی نہیں ہوتا۔ اور جب تک روح اپنے سے باخبر نہیں ہوتی اس وقت تک اس کا شمار مُردوں میں ہی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تک وہ اپنے خداوندی درجہ کو حاصل نہیں کر سکتی ہے اسی بات کو تمثیلی روایت میں ایک یہودی کے اپنے ایک عزیز قریب کے ہاتھ سے مارے جانے کے طرز پر بیان کیا ہے۔ مُردہ نعش کسی ملک یا دیار میں نہیں پڑی ہے

کی طرف دوڑتی ہے۔ ناچ ورنگ موٹرو گاڑیاں۔ رئیسی ٹھاٹ باٹ مہیا کرتا ہے
مگران تینوں پیمانوں ہی کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر زر کے یہ
سب چیزیں آئیں تو کہاں سے آئیں۔ اور روح تو بالکل ننگی بوچی ہی پیدا
ہوتی ہے۔ صرف ایک نفس کی پھپایی اس کے پاس ہے جو ذریعۂ معاش ہو
سکتا ہے۔ اس لئے عقل اسکو ہدایت کرتی ہے کہ اسی نفس کے ذریعے سے
تینوں پیمانوں کے لئے وافر سرمایہ لینے۔ ہر ایک کے لئے ایک ایک ایک
اشرفی اور مجموعی طور سے تین اشرفیاں پیدا کرنی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر
نفس کو مارنے کے کوئی کام بھی انسان نہیں کرسکتا ہے۔ اور بغیر کام کئے
زر آویگا کہاں سے۔ چاہے محنت مزدوری ہو چاہے نوکری یا وکالت ہو
یا کوئی روزگار یا دھندا ہو سب ہی میں اگر انسان نفس کو مار کر نہ بیٹھے اور کام
کرے تو ناکامیابی ہی ملے گی۔ کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے معنے دل
لگا کر یعنے جم کر کام کرنے کے ہیں۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان
طبیعت کو مار کر بیٹھے۔

اب معمولی ناواقف انسان تو صرف اس دنیا ہی کو اپنا مرکز خیال مانے بیٹھا
ہے اور اس ہی کی خوشی کا خیال اسکے دل میں سمایا ہوا ہے لیکن عارف یہ
جانتا ہے کہ روح کو موت نہیں آتی ہے اور اسکے بعد بھی اسکو جسم بنا
پیدا ہونا پڑے گا۔ اس لئے وہ عاقبت کی خوشی کا بھی جو یاں رہتا ہے۔

سود مند نہ ہوگی۔ اس لئے جبتک قربانی کرنے والا اپنے ہی نفس کی قربانی نہ
کرے گا اُس وقت تک اُسکی روح مردہ رہیگی اور چاہے جتنے حیوانات کی
قربانی وہ کیوں نکر ڈالے۔ کیونکہ ہر روح کا تعلق (Connection) اپنے
ہی نفس سے ہوسکتا ہے۔ کسی دوسرے کے جسم یا نفس سے نہیں ہوسکتا ہے
اگر عید الضحیٰ کے دن مومن نے ذبیحہ اور اپنی مردہ روح کے Connection
کا خیال نہیں رکھا تو ساری محنت ہی رائگاں گئی۔

بعد معجزہ کے جسم کا وہیں گر پڑنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بعد حاصل
کرنے درجہ خداوندی کے روح پھر جسم خاکی کی قید سے نکل کر عرشِ معلی پر جا پہنچتی
ہے کیونکہ روح کی صفت اُوپر کو اُڑنے کی ہے جیسا کہ مولانا روم نے فرمایا ہے

روح مے پرد سوئے چرخ بریں (۳۱۹) سوئے آب و گل شدے بر اسفلیں

ایسا مفہوم اس گائے کی قربانی کا ہے۔ ہائے افسوس کہ لوگ اب کیا کا کیا
سمجھ بیٹھے ہیں اور بجائے نفع کے نقصان عظیم و بے اندازہ اُٹھا رہے ہیں۔
یہ جان لینا چاہیئے کہ دوسرے کی قربانی سے خونخواری تو بڑھ سکتی ہے
لیکن پاکیزگی اور صفائی قلب اُس میں کہاں؟ خونخواری تو اصلی بہادری
نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ قیصر روم کا سفیر ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ملنے کے لئے
آیا۔ سفیر مسلح اور ہتیار بند تھا۔ مگر عمرؓ اکیلے بغیر کسی ہتیار کے سوئے ہوئے تھے
سفیر دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اسقدر اطمینان اور بہادرانہ اطمینان کہ خوف ہی دل

بلکہ خود ہستی روح کی سرزمین ہی ہے۔ اسی لئے کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے
موسیٰ رہبر دین ہے جسکے سامنے روح کی ہستی کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ مادہ پرست
روح کے وجود کے ہی قایل نہیں ہوتے ہیں۔ وہ کیوں اس امر کو تسلیم کرینگے
کہ ان کا کفر ہی روح کی ہلاکت کا باعث ہے۔

روح کے دوست عقل دانش فہم وغیرہ ہیں جو مادہ پرستوں پر اسکی ہلاکت
کا الزام رکھتے ہیں۔ مباحثہ میں مادہ پرست ہار ماننے کو تیار نہیں ہیں اور کوئی
بحث نہیں ہے جو کہ جھگڑالو ہٹ دھرم مادہ پرستوں کو زبردستی قائل کر سکے
اب اگر دین اپنی بزرگی اور شرافت کا سکہ انکے دلوں پر نہیں جما سکتا ہے تو
اسکی کرکری ہو جاتی ہے۔ اس لیے بحث مباحثہ کو چھوڑ کر اب وہ معجزہ دکھاتا
ہے۔ ہدایت ہوتی ہے کہ اچھا ایک بچھیا کی قربانی کر کے نعش مردہ سے ذبیحہ کو
چھواؤ۔ ایسا کیا جاتا ہے۔ مردہ ایک دم بھر کو کر اٹھتا ہے۔ یہ رمز خفیہ بتاتا ہے۔
یہ بچھیا نفس امارہ ہے۔ تمام عالم میں صرف بنیم ہی کی بچھیا میں وہ اوصاف پائے
جاتے ہیں جن کا ہونا قربانی گاؤ میں لازمی ہے اور کوئی گائے زندہ رہکر یا مر کر
اس مردہ کو زندہ نہیں کر سکتی ہے نفس کی گائے جیسے ہی مری کہ فوراً روح عقل
و ہوش خداوندی ظاہر ہوئے۔ اسی نفس کی گائے کی قربانی کرنی ہے اور سب
بڑا جزو رسم قربانی کا مردہ نعش سے ذبیحہ کا چھوانا ہے جیسے بجلی Connection
کنیکشن کے بغیر کام نہیں کرتی۔ ایسے ہی قربانی بھی بغیر Connection کے

اُس میں پایا جاتا ہے۔ مگر وہی اصلی تعلیم او رحقیقہ بھی ہے۔ چاہے وہ تھوڑی مقدار میں کیوں نہ ہو۔ ان اوراق کی غرض یہی ہے کہ سب مذہب اور خاص کر ہندو مذہب اور اسلام کا اختلاف دور کرے۔ ہندوؤں کے استعاروں اور تشبیہوں کا تذکرہ دیگر کتب میں کیا جاچکا ہے۔ اسلام کے جواہرات کا نمونہ یہاں پر پیش کیا جاتا ہے۔

میرے خیال میں ہر صاحب فہم کا فرض ہے کہ وہ سچے دل سے اپنے اور دوسرے کے مذاہب کا مطالعہ کرے اور اصلیت حال کا پتہ لگائے۔ ممکن ہے کہ کچھ اصحاب مجھ سے متفق نہ ہوں۔ مگر میں نے اپنی طرف سے کوئی بات بھی نہیں لکھی ہے جو کچھ کیا ہے وہ سب مستند درویشوں۔ اور فلاسفروں کے کلام کے زور پر کہا ہے۔ میرے اس ہدیہ میں تین باتیں پائی جاوینگی جو اسکی صحت کی کافی دلائل ہیں۔

اول یہ کہ یہ ایک مسلسل و باقاعدہ دفتر (فلسفہ) ہے جس سے ہر جزو ایمان وعمل کی وجہ موجہ معلوم ہو جاتی ہے۔

دوسرے اسی فلسفہ کے ذریعہ سے جابجا مبہم مسائل و نبایش خیالات وتشبیہات Allegories دانہ طور سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

تیسرے یہی فلسفہ معرفت و اعمال اور سب مذاہب کی بنیادی جڑ ہے اور سب میں پایا جاتا ہے یہی ایک نہ ایک روز سب کے اتفاق کا باعث ہوگا۔

ہیں جگہ نہیں پاتا ہے۔ ہاں اصلی بہادری خونخواری میں نہیں ہے۔ بلکہ موت کی طرف سے بیخوف ہونے میں ہے۔ میدان جنگ میں بھی اُنہوں نے اعلیٰ ترین کارگذاری دکھائی ہے جنکو مرنے کا خوف دامنگیر نہیں تھا۔ اور جود و سخا۔ اولوالعزمی۔ حوصلہ۔ عالی ہمتی۔ فراخدلی اور اصلی فیاضی بھی وہی دکھا سکتا ہے جو دوسروں سے ہیبت یا ہیبت ناکی سے نہیں بلکہ بغیر خوف انجام کے برتاؤ کرتا ہے۔ خونخواری۔ خونریزی۔ ایذا رسانی۔ و دل آزاری سے تو قلب سخت اور سیاہ ہو جاتا ہے۔ انسان رحم دل نہ بنکر سنگدل بن جاتا ہے جس کا حوصلہ نیک نہیں ہے۔ مولننا نے مثنوی میں فرمایا ہے ؎

چوں شگافد تو بہ آں را بہر کشت | دل بہ سختی ہمچو روئے سنگ گشت

دل جو سختی پاکے پتھر ہوگیا | توبہ اب اُس میں کرتی کاشت کیا

اِن اوراق کا مصنف مسلمان نہیں ہے۔ جین ہے۔ اور جین مت کو دل سے مانتا ہے۔ تاہم اُسکو دیگر مذاہب کے جواہرات کی تلاش میں بھی لطف آتا ہے زندگی بھر کے کھوج سے اُسنے اِس بات کو جان کیا ہے کہ فی الحقیقت سب مذاہب مروجہ نے (جیسے ہندو مت۔ عیسائی مذہب و اسلام) ایک ہی تعلیم وہی ہے۔ مگر اختلافات شاعرانہ بندش خیال کے باعث پیدا ہوگئے ہیں جین مذہب اور دیگر مذاہب میں بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں شاعرانہ بندشِ خیال و استعارہ و تشبیہ دہوکے میں ڈالنے والی نہیں ہیں اور زیادہ واضح طور سے فلسفہ دین

نہیں ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک میں راز داں لوگ ہوگئے ہیں۔
میں اُمید کرتا ہوں کہ اہلِ اسلام اور دیگر فرقوں کے لوگ اِس کتاب کو اُسی زاویہ نگاہ سے پڑھیں گے جس سے اِس کا نام "جواہرات اسلام" رکھا گیا ہے۔

ہندو مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کے بارہ میں بھی چند کلمہ یہاں پر غیر ضروری نہ ہونگے۔ میرے خیال میں دونوں فریقوں کو کسی وقت میں بھی اِس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہر دو قوموں کو اِسی ملک میں رہنا ہے اور سکھ کے ساتھ رہنے کی کوشش کرنا ہے۔ تحمل۔ بُردباری۔ ہمدردی کی نیک صفات ہی اِس لئے ہماری مدد کر سکینگی۔ جوش و خروش سے فساد بڑھ تو سکتا ہے مگر رفع نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی جھگڑا ہو جاوے تو اُس وقت اور بھی زیادہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ دانشمندی سے کام لیا جاوے۔ عدالت میں دونوں فریق ایک ایک لفظ سچ بولیں جس سے نقصان حقیقی کسی کو پہنچا ہو وہ اُس کو بلا پس و پیش قبول کرے اور اسکی کافی تلافی کرے۔ بزرگانِ قوم کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ اپنے فریق کے بدمعاشوں کے حامی و پشت پناہ نہ بنیں۔ ایسا کرنے سے وہ اپنے دین و دھرم کے کام کو بٹا لگاتے ہیں۔ چاہے ہندو مت ہو یا اسلام کوئی بھی مذہب کمینہ پن و بزدلی کا حملہ و چوری ڈکیتی وغیرہ نہیں سکھاتا ہے۔ اگر کوئی ہندو ایسا سمجھتا ہے کہ مسلمان کو مار ڈالنا۔ یا ایذا پہنچانا اُسکے

جیسا کہ میری دیگر کتب* میں دکھایا گیا ہے۔ مولنا روم نے تو یہاں تک کہدیا کہ

ہر نبی و ہر ولی را مسلکے ست لیک تا حق میبرد جملہ یکی ست

ہر نبی و ہر ولی کا راستا گو الگ ہے پر ہے ہر یک حق نما

فی الحقیقت اصلی تصوف معرفت یا جمنوسوفی (Gymnosophy۔) سب ملکوں اور قوموں کا ایک ہی رہا ہے۔ اختلاف محض تمثیلات (Allegories) کے باعث سے پیدا ہو گئے ہیں۔ جب نگاہ تمثیلات ہی کی طرف لگی رہتی ہے اور ان کا اصلی مفہوم معلوم نہیں ہوتا ہے تو انسان جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا شکار بن جاتا ہے۔ مگر جب متلاشی حق کو نورِ علمِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے تب اسکی چشمِ نابینا بینا ہو جاتی ہے اور اُس وقت اسکو اصلی یگانگت کا لطف ملتا ہے۔ یہ ان تمثیلات کا ہی لطف و کرم ہے کہ آج ساری دنیا مادہ پرستی کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے کیونکہ روشنی عقل (Science) کے سامنے تمثیلات کا چراغ کیسے جلے۔ حق کے متلاشی کو اس اصلی یگانگت مذاہب پر خوش ہونا چاہیئے اور تمثیلات کی پوٹ کو جسکے باعث لاتعداد انسان گمراہ ہو گئے اور دوست دشمن بن بن کر کٹ مرے احتیاط کے ساتھ الگ رکھ دینا چاہیئے۔ اِن سے بیوقت کی الفت اچھی اور روا نہیں۔

خود قرآن میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ فی الحقیقت اسلام کوئی نیا مذہب

*۔ دیکھو کی اوف نو یسیج کنفاو اسیس اوف او پوزٹش بزبان انگریزی۔ اتحاد المخالفین بزبان اردو۔ گوربانی۔ بزبان ہندی ٭

دفعہ تو ایسا اندھیر بھی ہو جاتا ہے کہ گنہگار کا تو پتہ نہیں لگا اور بیگناہ اسکی جگہ پھانسی دیئے گئے۔ گنہگار چھوٹ گیا اور بے گناہ پھنس گئے۔ یہ پُرجوش جہالت مذہب نہیں بلکہ سخت نامردی کا ٹیکہ ہے۔

اگر ہم اپنے اپنے دھرم کے اُصولوں پر عمل کریں اور مقدمات میں بالکل سچ بولیں تو ہمارے جھگڑے بہت جلد ختم ہو جاویں۔ اور ہمارے عقائد میں درگندھ (بدبو) کی بجائے سوگندھ (خوشبو کی مہک) پیدا ہو جاوے جس سے ہمارا اور ہمارے دھرم دونوں کا مُنہ باوجود فساد ہونے کے بھی اُجلا ہو جاوے یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیئے کہ جو ہندو مذہبی جھگڑوں میں جھوٹ بولتا ہے وہ اپنے دھرم کو کلنکت کرتا ہے۔ اور جو مسلمان ایسا کرتا ہے وہ اسلام کے ماتھے پر کالک لگاتا ہے۔ اور یہی حال اُنکے مددگاران کا ہے۔ چور کی طرح چھپ کر دغا کرنا اور پھر خوف کے مارے بھاگے پھرنا کوئی مذہب بھی نہیں سکھاتا ہے۔ اور نہ ایسا کرنے سے کسی مذہب یا اُسکے پیروؤں کی نیکنامی ہی ممکن ہے۔

میرے خیال میں مندرجہ بالا طریقہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں جماعتوں کے دلوں میں صفائی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہو گا۔

پچھلی آٹھ صدیوں کی فریقین کی کارگذاری پر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں ایک دوسرے کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ایک طرف چھوت چھات وذات پات کے پرہیز پر اسقدر زور دیا گیا کہ حد انسانیت سے بھی آگے بڑھ گئے

دھرم میں جائز ہے تو اسکو کچہری میں اقبال کرنے سے کیوں گریز ہوتا ہے۔ مسلمان کو مارتے یا ایذا پہنچاتے وقت تو وہ شیر تھا۔ مگر اب وہ بہادری اسکی کیا ہوئی۔ اب وہ کیوں اپنی بہادری کے کارنامہ کو چھپاتا ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان اس بات کو مان کر کہ اسلام کافروں کے مارڈالنے کی اجازت دیتا ہو کسی ہندو کو مارڈالے یا اسکو ایذا پہنچائے تو حاکم کے روبرو نامردی سے انکار کیوں کرے۔ اسکو تو یہی کہنا چاہئے کہ ہاں ہمارا مذہب ہمکو ایسا سکھاتا ہے میں نے ضرور اس نیک کام کو کیا۔ آپ اپنا فرض ادا کریں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اور میں پھر ایسا کروں گا۔ کیونکہ یہی میرا مذہب ہے۔

جب مہاتما گاندھی جج کے سامنے بیان دینے لگے تو انہوں نے یہی کہا کہ آپ کو میرے خلاف شہادت کی ضرورت نہیں میرا کام ہی وہ ہے جسے آپ بغاوت سمجھتے ہیں۔ میں پھر وہی کروں گا۔ میں نے اپنا کرتب کیا۔ آپ اپنے کرتب میں کمی نہ کریں۔ چھوٹنے پر میں اپنا فرض ادا کرونگا۔ ان بہادرانہ الفاظ نے جج کے بھی دل کو دہلا دیا۔ نامردی اور بزدلی سے تو مجرم اپنے کو ہی نامرد نہیں ٹھیراتا۔ بلکہ اپنے دھرم پر بھی دھبہ لگاتا ہے۔ اس نامردی کے انکار سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے نام پر مرنے والے فی الحقیقت مذہب سے کوسوں دور ہیں۔ وہ کیسا مذہبی دعوی کہ جو انسان کو سچ بولنا بھی نہ سکھا سکے۔ چور کی طرح جھوٹ کی پناہ لیکر جان بچانا چاہتے ہے۔ بلکہ یہی نہیں۔ بعض

حصّہ دوم

ترجمہ فارسی عبارت و اشعار

(۱) اگر جسم میں دِل نورِ علم سے روشن نہیں ہے تو اُس کو دفن کر دے کیونکہ خانۂ تاریک میں خالی فانوس کی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

(۲) شہوت کے سانپ کو شروع ہی میں مار۔ ورنہ یہ بہت جلد اژدہا بن جائیگا

(۳) نفس دوزخ کی خاصیت رکھتا ہے اور آتشی ہے اور کافر او فتنہ جو ہے۔

(۴) عقل کُل یعنی ہمہ دانی کے سامنے وہ علم جو روح کو حواس کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں ایسے ہیں جیسے کولھو کے گدھے جنکی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو

(۵) فاش راز نقشِ تن جب ہو گیا ✦ حال ہر ہر شے کا مجھ پر کھل گیا ✦

(۶) خام انگوروں میں بادہ ہے عیاں ✦ نیست میں ہستی کے ملتے ہیں نشاں

(۷) دیکھتا ہوں راز میں اسوقت سے ✦ جبکہ پیدا آدم و حوا نہ تھے۔

(۸) جب سے ہے یہ آسمانِ بے ستوں ✦ کچھ نہیں دانست میں میری فزوں

انسان کی بھی کوئی ہستی انکے سامنے نہ رہی۔

دوسری طرف مذہبی جنون میں اسقدر اُبال آیا کہ معقولیت اور غیر معقولیت کا سوال ہی نہیں اٹھنے پایا۔ ہر چیز دین کے نام پر جائز ورو ا مان لی گئی مسلمانوں نے تو یہاں تک ضد سے کام لیا کہ مٹی جیسی غلیظ چیز کو بھی اسلام کی علامت ہی بنا بیٹھے جیسے اسکی بجائے زیادہ صاف اور پاک تانبے و پیتل کے کلسوں کے استعمال سے دین ہی نرہے گا۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمدردی اور دوستانہ مروت سے کام لیا جائے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے مذاہب کو نیک نیتی اور خلق برادرانہ کے جذبہ کو دل میں جگہ دیکر سمجھنے کی کوشش کرینگے تو فی الوقع تفرقہ اور اسباب تفرقہ بہت جلد مفقود ہو جائینگے۔ کیونکہ اصلی چیز سب جگہ ایک ہی معرفت روحانی ہے اور جس وقت وہ انسان کے سامنے قاعدہ قرینہ سے صاف الفاظ میں اور عقلی طریقہ سے پیش کیجاتی ہے تو فوراً قبولِ خاطر ہوتی ہے۔ اگر بعد کو کوئی عارضی اختلافات رہ بھی جاویں تو بہ آسانی نکل سکتے ہیں۔ اور جو نہ بھی نکلیں تو وہ زاویہ نگاہ کے بدلجانے سے حسن خوبی دکھائی دینے لگیں گے۔ اور دلوں کے اندر اختلاف میں اتفاق کا لطف پیدا کرینگے کم از کم موجودہ حالت جو اتفاق میں نفاق کی ہے کسی طرح بھی نہیں قائم رہ سکے گی۔ اگر یہ اوراق خوشی کا دن اہل ہند کے سامنے لانے میں مددگار ہونگے تو انکا مصنف اِس ایک جھنی کو اپنی محنت کا ہزار گنا اجر سمجھے گا

(۲۲) جب واقف راز ہوجائیگا تب یہ بھید تجھ پر کھول دینگے۔ تاکہ تو آدھی رات کے آفتاب کو دیکھے۔

(۲۳) پاک روح اس لئے مشرق کی محتاج نہیں ہے کہ رات و دن کا امتیاز اُس کے طلوع میں نہیں ہوتا ہے۔

(۲۴) روز وہی ہوتا ہے جبکہ وہ طلوع ہوتا ہے۔ اُسکے سامنے تاریکی نہیں ٹھیر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ خود چمکدار ہے۔

(۲۵) جیسے ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہے۔ ویسے ہی آفتاب خود اُس نورانی آفتاب کے سامنے مثل نفی کے ہوتا ہے۔

(۲۶) وہ ایک ایسا نورانی خورشید ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو آنکھ اُسکے سامنے حیران و بیکار ہوجاتی ہے۔

(۲۷) عرش کے لامحدود نورمیں وہ مثل ذرہ کے نظر آتا ہے۔

(۲۸) ظاہری اعضا ہیں سات اور دس حواس ⁂ اور جو اندر ہیں وہ ہیں بے قیاس

(۲۹) تجھ کو اے دل جوں سلیماں برتری ⁂ جیسے وہ تھے حاکم دیو وپری

(۳۰) کر سے ہو ملک اگر تیرا بری ⁂ دیو چھینے کس طرح خاتم تری

(۳۱) بعد ازاں لے ساری دنیا تیرا اسم (نام) دو جہاں ہوں تیرے تابع مثل جسم

(۳۲) اگر تو اپنے دل کے دیدے کھولدے تو بہت جلد نایاب سُرمہ کو پالیگا۔

(۳۳) اپنی ناک اور دماغ سے فاسد خیالات کا زکام دُور کر۔ تاکہ خوشبوے روحانی

(۹) نورِ انبیا کے مقابلہ میں ہمارا احساس علم۔ خورشید کے سامنے دھواں دینے والے چراغ کی مانند ہے۔

(۱۰) جس شخص کو یہ نور (علم) ملجاتا ہے۔ اسکی وضاحت ابو سینا یعنی فلاسفر بھی نہیں کرسکتے ہیں۔

(۱۱) فہم مثلِ ریزہ زر ہے ترا ÷ مُہر سکّہ کی لگے ریزوں پہ کیا۔
(۱۲) عقل تیری سو جگہ ہے بٹ چکی ÷ مال و زر کی خواہشوں میں ہے پڑی
(۱۳) تیری جاں تقسیم ہے زیرِ فلک ÷ سینکڑوں سوداؤں میں ہے مشترک
(۱۴) عشق سے تو ریزہ ریزہ جسم کر ÷ تا خوشی حاصل ہو تجھ کو سربسر
(۱۵) جمع جو جو ہو کے جب ہو جائیگا ÷ سکّہ لگ جائیگا تجھ پر شاہ کا
(۱۶) ہو اگر مثقال سے افزوں تو خام ÷ تو بنا لے شاہ اک سونے کا جام
(۱۷) اس پہ بھی ہو نام اور القابِ شاہ ÷ شہ کی صورت بھی بنے اے بوالہوس خواہ

(۱۸) اِس نفس کے طلسم کو اپنے اندر توڑ دے۔ اور پیر کامل کا خزانہ حاصل کر۔

(۱۹) یہ جان لے کہ جب تو جسم کے قید سے آزاد ہو جائیگا۔ تو ہر عضو تیرا علم مجسّم ہو جائے گا۔

(۲۰) بایزید بسطامی نے سچ فرمایا ہے کہ عارفوں کا بال بال آنکھ بنجاتا ہے۔

(۲۱) اِس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ روشن ضمیر ارواح سے کوئی بات پوشیدہ رہ سکے ؟

خدا کے اپنے میں اور کچھ نہ پایا۔

(۴۳) جب ناواقفوں کے ہاتھ میں قلم ہو تو منصور کو تو سولی پر چڑھنا ہی ہوگا

(۴۴) جب کمینوں کا دور دورہ ہوگا تو نبیوں کا قتل تو ہوگا ہی۔

(۴۵) اے غنی اپنا ہی طواف کر کعبہ کا طواف کبتک کرتا رہے گا۔ کیونکہ قبلہ نما سے بڑھکر اس راہ میں اور کوئی رہبر نہیں ہے۔

(۴۶) اے بیہودہ تو کیوں کسی خدا کے پیچھے پھرتا ہے اگر وہ خدا (خود آ) ہے تو خود ہی آجائیگا۔

(۴۷) میں اُس وقت موجود تھا جب آدم نہ تھا۔ میں نے اُس وقت خدا کو سجدہ کیا جب خدا کی ذات وصفات کا بھی وجود نہ تھا۔

(۴۸) پیر وہ ہیں کہ اُنکی روح دریائے صداقت میں اس وقت موجود تھی جب یہ عالم ہی نہ تھا۔

(۴۹) کل ہمارا پیر مسجد سے نکلکر میخانہ کو چلدیا
اب بتاؤ تو دوستانِ طریقت ہمکو کیا کرنا چاہیئے۔

(۵۰) اے مسلمانو! میں کیا کروں کہ میں اپنے کو نہیں جانتا ہوں نہ گبر ہوں نہ یہودی ہوں نہ آتش پرست ہوں نہ میں مسلمان ہی ہوں

(۵۱) تو عود یعنی خوشبو کی کان ہی سہی۔ اگر تجھے آگ میں جلا ہیں تو تجھ سے تمام عالم معطر ہو جاوے۔

(۳۴) میں نے کہا عرش پر کون چیز قابلِ قرار ہوگی بجز اُس خوشی کے جو میری ذات ہی میں موجود ہے۔

(۳۵) مٹکے میں کون چیز ہو سکتی ہے جو نہر میں نہ ہو۔ گھر میں وہ شئے کہاں سے آوے جو شہر میں نہ ہو۔

(۳۶) یہ جہان مٹکا ہے اور دل دریا کی مانند ہے۔ جہان کوٹھڑی کی طرح ہے اور دل اک عجیب شہر ہے۔

(۳۷) تو ہی بادشاہ ہے۔ تو ہی فوج ہے۔ اور تو ہی تخت شاہی ہے۔ تو ہی بلند اقبال ہے۔ اور خود اقبال بھی تو ہی ہے۔

(۳۸) پس جب کہ اے واقف راز تو خود ہی بخت ہے۔ پھر بخت ہوتے ہوئے تو اپنے سے کم کیسے ہو سکتا ہے۔

(۳۹) تیرے اِس جہان کی خوشی کی خواہش۔ اُس جاودانی خوشی کی سدِ راہ ہوگئی ہے۔

(۴۰) میں نورِ الٰہی ہوں کہ اس عالم میں ٹھہرا ہوں۔ میں آبِ حیات ہُوں جو اِس دریا میں رواں ہُوں۔

(۴۱) میں خدا ہُوں اور بلند آواز سے کہتا ہُوں۔ جو آفتاب اور ماہتاب کو نُور بخشتا ہے وہ میں ہُوں۔

(۴۲) میں شمس تبریز بھی عجب ذات ہوں۔ جب میں نے اپنے کو دیکھا تو جز

(۶۲) جہاں میں چراغ دان سے ایک لمحہ کے لئے بھی چمک جاؤں وہاں دنیا کے معمہ حل ہو جاویں۔

(۶۳) جہاں کہیں بدبختی کا اندھیرا پھیلا ہو تو وہ میرے نور سے شمس الضحیٰ ہو جائے۔

(۶۴) جو تاریکی آفتاب سے مٹائے نہ مٹ سکے۔ وہ میرے دم سے صبح صادق میں بدل جاتی ہے۔

(۶۵) شراب کی مستی ہماری ذات سے ہے۔ ہم شراب سے مست نہیں ہیں عالم ہم سے ہے۔ ہم عالم سے نہیں ہیں۔

(۶۶) علاماتِ روح سے مجھکو حیرت ہو گئی۔ اس کا پتہ کہنے سے نہیں ملتا ہے

(۶۷) تو ہی ظاہر میں عاشق باطریق ہے۔ تو ہی فی الحقیقت معشوق ہے

(۶۸) اگر اپنا بھید تجھکو معلوم ہو جائے تو خدا اور خلق دونوں کا حال معلوم ہو جائے

(۶۹) اسی لئے بحر صفا میں فرمایا ہے کہ میرے جبہ میں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

(۷۰) تو خود عین آب ہی اور آپ (پانی) کو ڈھونڈتا ہے۔ اپنے خزانہ کو بھول گیا ہے اور اب تعجب کرتا ہے۔

(۷۱) تو بادشاہ ہے پھر بھکاری کیوں بنتا ہے۔ تو خزانوں کا مالک ہے پھر گدا (فقیر) کیونکر ہے۔

(۵۲) تو وہ خود نہیں ہے کہ جلنے سے کم ہوجاؤ یگانہ تو وہ روح ہے جو واقعی غم کی قید میں رہ سکے۔

(۵۳) تو صاحب مکان ہے مگر اصل تیری لامکان ہے۔اس دکان کو بند کر اور اس دوکان کو کھول۔

(۵۴) جان کی چڑیا کا قصہ ایسا ہے جو واقف کار لوگ جانتے ہیں۔

(۵۵) بظاہر تو ایک چڑیا ضعیف و بے گناہ مگر اصلیت میں وہ سلیمان مع لشکر کے ہے۔

(۵۶) اگر وہ روئے تو سات آسمان میں تہلکا پڑ جائے۔

(۵۷) کیسی چڑیا ہے کہ وحی اسکی آواز ہے۔آغاز کے آغاز سے پہلے سے اس کا وجود ہے۔

(۵۸) تیرے اندر ایسی چڑیا پوشیدہ ہے کہ اس کا عکس ہی تجھکو ادھر ادھر دکھائی دیتا ہے۔

(۵۹) وہ راز جو آدم کو بھی نہ معلوم ہوا تجھکو وہ اسرار عالم بتاتا ہوں۔

(۶۰) وہ راز میں نے خلیل کو بھی نہیں بتایا۔جبرئیل اس راز کو نہیں جانتا ہے۔

(۶۱) کبھی تجھے تو کہتا ہوں اور کبھی میں کہتا ہوں۔کچھ بھی کہوں میں منور آفتاب ہوں۔

آئینوں (خوبیوں) کو پائے گا۔

(۸۲) میرا دل فی الحقیقت ایک لوح ہے۔ جو کچھ تو چاہے اُس سے حاصل ہو سکتا ہے

(۸۳) نقشِ الٰہی کی صورت خود تو ہی ہے۔ جملہ اشیاء کا عارف (جاننے والا) تُو ہی ہے۔

(۸۴) دنیا میں وہ چیز جسکو تمام جہان چاہتا ہے تو ہی ہے۔ جانئے کو پہچان

(۸۵) نفس اور شیطان شروع سے ہی ایک ہیں۔ یہ انسان کے دشمن اور حاسد ہیں۔

(۸۶) عقل کی عقل اور جان کی جان اے جان تو خود ہی ہے۔ اور دنیا کی عقل اور جان کا سلطان تو ہی ہے۔

(۸۷) عقلِ کل (فرشتہ جبرئیل) بھی تجھ کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ جملہ موجودات تیرے زیرِ فرمان ہیں۔

(۸۸) تُو جو دُکان میں بیٹھا گدڑی سی رہا ہے۔ تجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ اِس دُکان کے نیچے دو کانیں پوشیدہ ہیں۔

(۸۹) یہ دو کان تیری کرایہ کی ہے جلدی کر!! بسولا لے اور اسکی سطح کو کاٹ ڈال!!

(۹۰) اِس بھاری گدڑی میں جو جوڑ لگا رہا ہے تو اس پارہ دوزی کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ عمر پانی اور روٹی کی تلاش میں صرف کرنے۔

(۷۲) یار نقاب کے اندر چھپا ہوا ہے۔ جیسے دریا حباب کے اندر چھپا ہوتا ہے
(۷۳) پردہ اٹھا اور یار کا جمال دیکھ۔ آنکھ کھول اور راز کو دیکھ!
(۷۴) بھید کھل جانا باعث بے پردگی کا ہوتا ہے۔ تیری ہی ہستی تیرے اوپر نقاب بن گئی ہے۔
(۷۵) ارے لوگو! کعبہ کو حج کرنے کے لئے کہاں جاتے ہو؟
معشوق تو یہیں ہے۔ آؤ چلے آؤ!!
(۷۶) معشوق تو تمہارا نزدیک پڑوسی ہی ہے۔ دیوار سے دیوار ملی ہے۔
جنگل میں بلا وجہ کیوں سرگردان ہوتے ہو؟
(۷۷) میں تو مثل بلندی پر رہنے والے پرندے کے ہوں مجھے مکھی کا ڈر کیسے ہو؟ مکھی کو کب مجھ پر دسترس ہو سکتی ہے۔
(۷۸) اگر میں اپنی پستی کی طرف لیجانے والی صفات سے رنجیدہ ہو جاؤں فرشتوں کی طرح اوپر کو اڑ جاؤں۔
(۷۹) میرے پر بھی میرے ہی ذات میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے وہ پر لیکر سرِ پشت سے جوڑ لئے ہوں۔
(۸۰) انسان کی ذات کی نقاب (پردہ) میں نورِ حق کی تجلیاں (روشنی) ہیں اگر غیبی شہادت مانگتا ہے تو وہ کب ممکن ہو سکتی ہے۔
(۸۱) فی الحقیقت خود تو ہی قرآن اور سورہ فاتحہ ہے خود اپنے ہی میں اپنی

پھول ہو جاوے - اور

(۱۰۲) روحانی خلعت تجھکو ملے تو طفل دیدہ کو جسم کے اوپر رولا -

(۱۰۳) تن محدود کی یہ لٹیا کیا ہے جس میں حواس کا کھاری پانی بھرا ہوا ہے

(۱۰۴) لٹیا کی پانچ ٹونٹیاں حواس خمسہ ہیں - انکو تو ہر قسم کی ناپاکی سے پاک رکھ

(۱۰۵) جبکہ کوزہ میرا بحر کی طرف رجوع ہو جب یہ اوصاف بحر کو پاوے -

(۱۰۶) اُسکے بعد اُس کا پانی بے نہایت ہو جاویگا - اُس وقت میری لٹیا سے سو جہان بھرپور ہو جاوینگے -

(۱۰۷) جو شخص راحت سے زندگی بسر کرتا ہے اُس کا مرنا تلخی کا ہوگا - جسنے جسم کی پرستش کی اُسنے جان کا گھاٹا ہوا -

(۱۰۸) تن اسمٰعیل اور جان خلیل ہے - جان نے فربہ جسم پر تکبیر پڑھی یعنی اسکی قربانی کی -

(۱۰۹) روح کا رجحان حیات و زندگی کی طرف ہے کیونکہ روح کی اصل لامکان سے ہے -

(۱۱۰) روح کا میلان معرفت و علوم کی طرف ہے - جسم کا میلان باغ و صحرا کی طرف ہے -

(۱۱۱) ہے ترقی و شرف میں میل جاں ٭ میل تن اسباب میں ہے بیگماں

(۱۱۲) نیز سے صدق کا جوہر باطل میں پوشیدہ ہے - جیسے دہی میں مکھن

(۹۱) ہر دفعہ یہ تیرے تن کی گدڑی پھٹی رہتی ہے اور تو اُس پر روٹیوں کا پیوند لگاتا ہے۔

(۹۲) ارے تو تو بادشاہانِ کامیاب کی نسل سے ہے اِس ذلیل پارہ دوزی کو چھوڑ اور اپنے کو پہچان۔

(۹۳) دوکان کی سطح کو کھود ڈال تاکہ تجھے دونوں پوشیدہ کانیں ملجاویں۔

(۹۴) لوہے کی زنجیر کو جُدا کر سکتے ہیں۔ قیدِ غیبی کی دوا کسیکو معلوم ہی نہیں

(۹۵) بند پوشیدہ ہیں۔ لیکن لوہے سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ کیونکہ لوہے کے بند کو تو تبر کاٹ سکتا ہے۔

(۹۶) تیرا تنِ خاکی کیا ہے؟ اِک بیگانہ ہے جسکے لئے تو غمناک ہے۔

(۹۷) جبتک تو جسم کو شیرینی دُمرغن اشیا کھلاتا رہیگا۔ اُس وقت تک جوہر جان (روح) کو طاقتور نہیں ہوتے دیکھے گا

(۹۸) اگر مشک میں بھی بدن کو رکھیں تو بھی مرنے پر اُس سے بدبُو ہی نکلے گی۔

(۹۹) عیسیٰ سے یہ دعا نہ مانگو کہ تن زندہ رہے۔
موسیٰ سے فرعونی افعال مت چاہو۔

(۱۰۰) کیونکہ یہ بدن جو مٹی اور پانی سے بنا ہے جوہرِ جان کا منکر و ضیار روح کا چور ہے۔

(۱۰۱) اگر یہی تیری خواہش ہے کہ تیری مشکل حل ہو جاوے اور محرومی کا کانٹا

تیرا کوئی دشمن ہی نہ رہے۔

(۱۲۲) اُسکی بدولت یہ دنیا تجھ پر تنگ ہو رہی ہے۔
اُس کے باعث تو حق و خلق سے مشغولِ جنگ ہے۔

(۱۲۳) پس تو اُس بدذات کو مار ڈال۔ جسکے لئے تو ہر دم اپنے عزیزوں
کی جان کا خواہاں ہوتا ہے۔

(۱۲۴) یہ کبتک کہتا رہیگا کہ میں عالم کو قابو میں لاؤنگا۔ اور کل جہان کو
اپنا بناؤنگا۔

(۱۲۵) اِس مردار کو کتوں کے آگے ڈالدے۔ غرور کی کانچ کے ٹکڑے ٹکڑے
کرڈال۔

(۱۲۶) جس شخص نے کافر نفس کو مار ڈالا اُس کا حکم آفتاب اور ماہ پر بھی لگے
(۱۲۷) گدھے کو پکڑے اور اُسے رستہ پر ہانک۔ کیونکہ اُس کی طبیعت کا میلان
گھاس کی طرف ہے۔

(۱۲۸) تیرے رستہ میں دشمن یعنی گدھا ہے جو چارہ پرست ہے بہتوں کو
اِس خر (گدھے) نے غارت کیا ہے۔

(۱۲۹) اگر ایک دم کے لئے بھی تو غفلت سے رستے ڈھیلا کر دیگا تو وہ اور رودِ خر سنگ
گھاس کی طرف جا دوڑے گا۔

(۱۳۰) گدھے کی گردن پکڑ کر اُسکو راہ پر لا۔ اور خوش بخت لوگوں کے رستہ

چھپا ہوا ہو۔

(۱۱۳) وہی یہی تیرا خاکی تن ہے۔ اور صدق رُوحِ ربانی ہے۔

(۱۱۴) مدت سے یہ دوغ تن ظاہر و موجود ہے۔ اور روغنِ جان اُس میں فانی و مردہ ہے۔

(۱۱۵) روغن (گھی یا مکھن) وہی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اُسکو جو کچھ بنانا چاہو وہ بن جاتا ہے۔

(۱۱۶) افسوس ہے اُس زندہ پر جو مُردہ کا ہم صحبت ہوا۔ اور اُسنے مردہ ہو کر زندگی کی جستجو کی۔

(۱۱۷) یہ جہان نفی ہے تو (مطلوب کو) اثبات (ہستی) میں ڈھونڈ۔ صورت تیری مثل نقطہ (صفر) کے۔ ہے مفہوم کا پتہ لگا۔

(۱۱۸) جب وہ جہان ملجائے تو یہ جہان نیست ہے۔ وہ جہان پنہان نظر دل سے ہے۔

(۱۱۹) لذتوں اور شہوتوں کا ترک ہی اصل سخاوت ہے۔ جو شہوت سے مغلوب ہو گیا وہ پھر نہیں اُٹھا۔

(۱۲۰) تن کی لکڑی کو جان کے پاؤں میں سے نکال پھینک تاکہ وہ پرستان کی سیر کر سکے۔

(۱۲۱) نفس کو اگر تو مار ڈالے تو جھنجھٹوں سے چھوٹ جاوے۔ پھر دنیا میں

(۱۴۳) اے خوش انجام کہ جو اپنے عیب دیکھتا ہے۔ دوسرے کے عیبوں کو بھی جو اپنے میں ڈھونڈتا ہے۔

(۱۴۴) جسنے دوسروں کے عیبوں کو دیکھ کر اپنا عیب پہچانا۔ اُس نے کمالِ ذاتی کو بہت جلد حاصل کر لیا۔

(۱۴۵) حریصوں کی طمع کبھی پوری نہ ہوئی۔ سیپی موتیوں سے اُس وقت پُر ہوئی جب اُس نے قناعت سے اپنا منہ بند کر لیا۔

(۱۴۶) زانیوں کا گندہ اندام نہاں۔ اور مے نوشوں کا گندہ ہے دہاں۔

(۱۴۷) باہر کی آگ پانی سے بُجھ سکتی ہے۔ شہوت کی آگ انسان کو دوزخ تک پہنچا سکتی ہے۔

(۱۴۸) شہوت کی آگ پانی سے نہیں بجھتی ہے کیونکہ وہ عذاب دینے میں دوزخ کی خاصیت رکھتی ہے۔

(۱۴۹) نارِ شہوت ہو بڑھانے سے نہ کم ٭ ہاں ٹھہرنے سے ہو کم اے محترم

(۱۵۰) آگ میں رکھتا ہے جب تو لکڑیاں ٭ پھر بجھے کیا آتشِ شعلہ فشاں

(۱۵۱) لکڑیوں کو کھینچ بجھ جائیگی آگ ٭ آبِ تقوی کو ہے اِس آتش سے لاگ

(۱۵۲) جس شخص کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔ اُسکی نجات میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا ہے۔

(۱۵۳) کنجوسی کی بیڑیاں ہاتھ اور گردن سے دُور کر۔ اور نئی تقدیر چرخ کہن ست

پر اسکو لاجد بان اور واقفکار لوگ ہو گئے ہیں۔

(۱۳۱) اور اگر رستہ تجھے معلوم نہیں ہے تو تو جو کچھ گدھا تجھے کرنے کو کہے اُس کے خلاف کر

(۱۳۲) اگر تو اپنے نفس سے مشورہ کرتا ہے تو جو وہ بدذات کہے اُسکے برعکس کر۔

(۱۳۳) افعال کا یہی طریق ہے کہ وہی فعل کمالیت کا ہوتا ہے جو نفس کے مشورہ کے خلاف ہو۔

(۱۳۴) تیغ آہن سے ہے تیغ حلم تیز ✣ بڑھ کے ہے سو لشکروں سے رستخیز

(۱۳۵) اے بھائی ڈنک کی تکلیف کو برداشت کرلے تاکہ تو موذی نفس کے ڈنک سے چھٹکارا پاوے۔

(۱۳۶) حسد نقصان کا باعث اور عیب ہے بلکہ اور عیبوں سے بڑھ کر ہے۔

(۱۳۷) عیب بینی کا بال اپنی دونوں آنکھوں سے نکال ڈال۔ تاکہ تجھکو غیبی باغ و باغیچہ نظر آویں۔

(۱۳۸) تمنے جب اس نفس شعلہ خو کے ساتھ ✣ آتشی اور گبر فتنہ جو کے ساتھ

(۱۳۹) جہاد کرکے کرلیا اُسکو صفا ✣ اور بجھایا آگ کو بہر خدا

(۱۴۰) آتش شہوت جو شعلہ تاب تھی ✣ سبزہ اور نور ہدایت بن گئی

(۱۴۱) غصہ کی آتش ہوئی جب تم سے حلم ✣ جہل کی ظلمت ہوئی بس تم سے علم

(۱۴۲) آگ بدلی حرص کی ایثار میں ✣ بدلا پھر خار حسد گلزار میں

قاعدہ قرینہ سے بڑھنے نہیں دیتا۔

(۱۶۴) یہ نفس امارہ دوزخی ہے۔ کیونکہ یہ جزو دوزخ ہے اور جزو کل کی خاصیت رکھتا ہے۔

(۱۶۵) چونکہ تیرے ساتھ نفس کی علت لگی ہوئی ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی کرتا ہے وہ تیرے مرض کو بڑھاتا ہے۔

(۱۶۶) نبیوں کو مکان ناگوار معلوم ہوا۔ بادشاہوں کی طرح وہ لامکان کو چلے گئے۔

(۱۶۷) مردوں کو یہی یہ جہان چاک تک الا دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر میں تو یہ وسیع ہے۔ لیکن فی الحقیقت نہایت تنگ ہے۔

(۱۶۸) نفس و شیطان دونوں ایک ہی شکل کے ہیں اگرچہ یہ دو صورتوں میں اپنے کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱۶۹) جسکو خدا کا راز مل گیا اُسکے سامنے عالم کے اسرار کیا چیز ہیں۔

(۱۷۰) اگر تو اس چمڑے کی تھیلی کو روٹیوں سے خالی کرے تو تو اُسکو نایاب موتیوں سے بھرا پاویگا۔

(۱۷۱) جسکے اوپر جان کا شیریں تبسم ہوا اُسکو دنیا کی ترش روئی سے کیا نقصان پہنچ سکے۔

(۱۷۲) جسکی آنکھوں کو جان (روح) چومتی ہے اُسکو فلک اور اُسکی خفگی کا کیا ڈر

دستیاب کر۔

(۱۵۴) جسنے اپنے کو خواہشات سے چھڑالیا۔ اُسنے اپنے کانوں کو آشنائے راز بنالیا۔

(۱۵۵) جبکہ یہ دولت ہے تیری عارضی ۔ پھر چڑھی رہتی ہیں کیوں مونچھیں تری

(۱۵۶) جب بُری عادت مستحکم ہوجاتی ہے تو شہوت کی چیونٹی سانپ بن جاتی ہے

(۱۵۷) اے کالی دیگ تیرے اُوپر جو زنگ چڑھ گیا ہے اُسنے تیری اندرونی سیما کو برباد کردیا ہے۔

(۱۵۸) تیرے دل پر زنگ پر زنگ اسقدر چڑھ گئے ہیں کہ تو اندھا ہوگیا ہے اور اسرارِ الٰہی تجھ کو نظر نہیں آتے ہیں۔

(۱۵۹) زمانہ اگر چلا گیا تو جانے دے۔ تو خود قائم رہ کیونکہ تیرے برابر کوئی پاک نہیں ہے۔

(۱۶۰) اے پسر بند کو توڑدے اور آزاد ہوجا۔ کب تک تو چاندی اور سونے کا یعنی طمع کا غلام بنا رہے گا۔

(۱۶۱) ایسے شیر آسانی سے بن جاتے ہیں جو صفوں کو چیر ڈالیں۔ مگر اصلیت میں شیر وہی ہے جو اپنے پر فتح پائے۔

(۱۶۲) اِس فانی عالم سے دل کو ہٹالے اور کوشش کر کہ سوائے حق سب کا ترک کرسکے۔

(۱۶۳) خوش انجام جہاد کرتا ہے اپنے تن کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا ہے اور اسکو

حُر (آزادوں) کی نہیں ہے۔

(۱۸۲) جبتک اصلی غذا کے قابل بن جاوے اور نور کے لقموں کو نوش کر سکے

(۱۸۳) جب ایسا بھی نورانی غذا کھاویگا تو تنور کی روٹی پر لعنت بھیجے گا۔

(۱۸۴) جب یہ مُونہہ بند کر لیا تو ایک مُنہہ اور کُھل گیا۔ جو علمی لقموں کا کھانے والا ہے۔

(۱۸۵) غم نہ کھا اور غم کی بڑھانے والی روٹی بھی نہ کھا۔ کیونکہ عقلمند آدمی غم کھاتا ہے اور تجھے شکر۔

(۱۸۶) خوشی کی شیرینی تیرے غم کے باغ کا میوہ ہے۔ دُنیا کی خوشی زخم کی مانند ہے اور روحانی خوشی مرہم زخم ہے۔

(۱۸۷) موت کے دن کے لئے اسی وقت مرحبا۔ تاکہ عشق معرفت سے تو دانا ہو جاوے۔

(۱۸۸) طمع کے تین ہی حرف ہیں اور تینوں ہی خالی ہیں۔
طمع سے آدمی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

(۱۸۹) تیری اس جہان کی تمناؤں کی طمع خوشی اصلی پر پردہ بن گئی ہے

(۱۹۰) اس جہان پُر غرور کے حظ کے لالچ نے تجھ کو عبادتِ ابدی سے محروم کر دیا ہے

(۱۹۱) راحتِ جہان ایمان غدار مال معلوم ہوتی ہے۔ جب مال جمع ہو گیا

(۱۷۳) صید کی تلاش کی جستجو شکار پکڑنے کے لئے چلا۔ ہرن کے نشان کو اُسنے دیکھا اور اُس کے نشان پر چلا پایا۔

(۱۷۴) تھوڑی دور تک وہ ہرن کے نقش پا پر چلتا ہے پھر اُسکو خود نافہ یعنی مشک کی بو آنے لگتی ہے۔

(۱۷۵) نافہ کی خوشبو کو سونگھتے ہوئے ایک منزل کا سفر ہی گام و طواف کی سو منزلوں سے بہتر ہے۔

(۱۷۶) زاہد مہینہ میں ایک مرتبہ پیشگاہ تک پہنچتا ہے۔ عارف ہر لمحہ تخت شاہ کے پاس ہی بنا رہتا ہے۔

(۱۷۷) عاقبت کے رنج سے بچنے کے لئے یہاں اپنے اوپر ریاضت کی سختی کو گوارا کرتے ہیں۔

(۱۷۸) جبتک سالک اپنی بقا کو نہیں پا لیتا ہے اپنے تن کو سقیم و ہلاک بناتا ہے یعنی اُسکو بیمار اور مرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

(۱۷۹) ریاضت کے سبب تن کا مرنا عین زندگی ہے۔ اِس تن کی مصیبت روح کا اُستحکام ہے۔

(۱۸۰) رُوح کی غذا سوائے خدا اور کوئی چیز نہیں ہے اُسکے سوا اور کسی چیز سے طاقت نہیں آتی ہے۔

(۱۸۱) اِن غذاؤں سے تھوڑا تھوڑا کم کر کیونکہ یہ غذا خر (گدھے) کی ہے

(۲۰۱) جزو میں کل کی خاصیت ہوتی ہے

(۲۰۲) اُس کو مثل عید کے چاند کے پاک نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ ہر آنکھ
اُس ماہ پارہ کی جلوہ گر نہیں ہوتی ہے۔

(۲۰۳) کوئی ایسی مشکل نہیں ہے جو آسان نہو جائے۔ مرد کو ہمت ہاتھ
سے نہیں کھودینا چاہیئے۔

(۲۰۴) اس درگاہ کے طریقوں میں نا اُمیدی کی گنجایش نہیں ہے۔ اگر سو بار
توبہ کرکے بھی توڑ دی ہے تو پھر بھی توبہ کرنا فائدہ مند ہوگا۔

(۲۰۵) اِس خیال سے گناہ مت کر کہ پھر توبہ کرکے میں محفوظ ہو جاؤنگا۔

(۲۰۶) توبہ کے تاب و آب کی ضرورت ہے۔ تجلی اور ابر توبہ کے لئے لازمی ہیں

(۲۰۷) یہی طریقہ ہے کہ ابر و برق ہونگے تب میوہ پیدا ہوگا

(۲۰۸) جب برق دل اور توبہ کے آنسو پیش رواں ہوں تب ہی غضب اور غصہ کی آگ
ٹھنڈی ہوگی۔

(۲۰۹) جب تک ابر چشم سے بارش نہیں ہوگی اور جبتک بجلی کا خندہ نہوگا

(۲۱۰) اُس وقت تک ذوقِ وصال کا سبزہ کیسے اُگے گا۔ اور چشموں سے
آبِ زلال کیسے نہ نکلے گا۔

(۲۱۱) تو جو آجکل کرتا ہے اِس بات کو جان لے کہ جتنا زمانہ بسر ہوتا جاتا ہے

(۲۱۲) وہ بدی کا درخت مضبوط ہوتا جاتا ہے اور اُس کا اکھاڑنیوالا کمزور اور ضعیف

تب وہ جان کا وبال ہو جاتا ہے۔

(۱۹۲) نے کی طرح سے اپنے تئیں سر سے پاؤں تک خالی کرے ورنہ بوسہ لب لعل جاناں نہ ملیگا۔

(۱۹۳) جس کا جامہ عشق نے پھاڑ ڈالا وہ حرص اور باقی اور عیبوں سے پاک ہو گیا۔

(۱۹۴) اگر تو رحم کا طالب ہے تو اُس پر رحم کر جو چشم پُر نم ہے۔ اگر تو رحم چاہتا ہے تو کمزوروں پر رحم کر۔

(۱۹۵) چیونٹی کو مت ستاؤ کہ دانہ کھینچتی ہے۔ اُس کے بھی جان ہے اور جان شیریں ہی ہے۔

(۱۹۶) رُوح جو سوئے چرخ بریں پرواز کرتی ہے۔ مٹی اور پانی کی سمت کا رجحان اُسکو جہنم کو بیچتا ہے۔

(۱۹۷) بادشاہ نے شیخ سے درمیان گفتگو کہا کہ کوئی چیز مانگ جو میں تجھکو دوں

(۱۹۸) شیخ نے جواب دیا کہ اے بادشاہ تجھ کو شرم نہ آئی کہ مجھ سے ایسی گفتگو کی

(۱۹۹) میرے دو بندے ہیں اور دونوں حقیر ہیں۔ لیکن وہ دونوں تیرے حاکم اور مصاحب ہیں۔

(۲۰۰) شاہ نے سوال کیا کہ یہ تو ذلت کی بات ہے۔ وہ دو بندے تیرے کون ہیں شیخ نے فرمایا۔ ایک غصہ اور دوسرا شہوت ہیں۔

(۲۲۳) گہہ خیالِ سیر گہ فکرِ دکاں ✤ گہ خیالِ علم و فکرِ خانمان

(۲۲۴) گہ خیالِ کسب یا سوداگری ✤ گہ خیالِ تاجری و نہری

(۲۲۵) گہ خیالِ درہم و اولاد و زن ✤ گہ خیالِ نعوولافِ بو الحزن

(۲۲۶) گھر کے ساماں کا کبھی تو ہے خیال ✤ فرش و بستر کا کبھی و لکو ملال

(۲۲۷) آسیا کی فکر ہے گہ فکرِ باغ ✤ گہ خیالِ ابرو گرد و باد و لاغ

(۲۲۸) ہے کبھی کچھ فکر صلح و جنگ کی ✤ اور کبھی کچھ دھن ہے نام و ننگ کی

(۲۲۹) اِن خیالوں کو تو سر سے نکال ✤ اِس تلوّن سے نہ دے دل کو ملال

(۲۳۰) ہاں ٹک چھوڑ اس دم دھیان ہے ✤ کیا زباں سے بلکہ دل اور جان سے

(۲۳۱) اے دل تو مستی پر نازاں نہ ہو۔ عیسیٰ کی مستی بباعث حق کے ہے۔ گدھے کی جو کے سبب سے ✤

(۲۳۲) ایسے خم سے پی شراب عنبریں ✤ جسکی مستی تنگ ظرفوں سے نہیں

(۲۳۳) ہے ہر اک معشوق مثل خم بھرا ✤ ایک تلچھٹ ایک موتی سا صفا

(۲۳۴) ہوش سے چکھ تو اے ادمی شناس ✤ تاکہ بے میل آئے بادہ تیرے پاس

(۲۳۵) چاند از قسم پتھر و مٹی کے ہے۔ اُس کا مشرق بھی پتھر مٹی میں ہے جانِ جان جان ہوتی ہے۔ اور اُس کا مشرق دل ہوتا ہے۔

(۲۳۶) جس طرح پر قدرت تن کی جان سے ہوتی ہے اِسی طرح پر جان کی قدر نور روحانی کے باعث سے ہے۔

(۲۱۳) کانٹوں کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے اور پھیلتی جاتی ہے۔ اور اُس کا اُکھاڑنے والا سست اور لاچار ہوتا جاتا ہے۔

(۲۱۴) بدی کی بیل ہر روز و ہر دم زیادہ زیادہ سبز ہوتی جاتی ہے۔ اور خارکن کی جو اُسکو اُکھاڑنا چاہتا ہے کمزوری اور ناتوانی بڑھتی جاتی ہے

(۲۱۵) وہ زیادہ جوان ہوتا رہتا ہے اور تو ضعیف تر۔ جلدی کر اور اپنے کام میں نہ چوک۔

(۲۱۶) خار بن تو سمجھ لے کہ تیری ہی بری عادت ہے۔ بہت مرتبہ اُسکے کانٹے تیرے پاؤں میں چُبھے ہیں۔

(۲۱۷) بارہا تو فعل بد سے نادم ہوا ہے اور ندامت کے رستہ پر آیا ہے

(۲۱۸) جب سال ختم ہو گیا کشت کا وقت نہیں رہا۔ پھر ندامت اور سیہ رُوئی کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔

(۲۱۹) جسم کے درخت کی جڑ میں کرم لگ گئے ہیں اُس کو اُکھاڑ کر آگ پر رکھ دینا چاہیئے۔

(۲۲۰) اے راہ رو وقت بہت ضائع گیا۔ تیری عمر کا آفتاب اب بیٹھا چاہتا ہے۔

(۲۲۱) اور قابو میں یہ دو دن ہیں ترے ✤ کوششیں کرلے کچھ اپنے جود سے

(۲۲۲) بیج جو تھوڑے سے ہیں بو دے یہیں ✤ تا یہ کچھ پھل دے اُٹھیں انجام میں

ہو جاتا ہے۔

(۲۴۶) تو سایہ ہے اور آفتاب پر عاشق ہوا ہے جب آفتاب آتا ہے سایہ فوراً غارت ہو جاتا ہے

(۲۴۷) جب شراب توفیق کی افزونی ہوتی ہے قوتِ شراب سے ظرف شکست ہو جاتا ہے

(۲۴۸) جامہ معجزوں کی جان یہی ہے کہ مردہ کو حیاتِ ابدی عطا کردے۔

(۲۴۹) اے حال پرست مردوں کو عورتوں پر اسوجہ سے شرف حاصل ہے کہ مرد انتہا کا دُور اندیش ہوتا ہے۔

(۲۵۰) میں اُسوقت موجود تھا جب آدم نہ تھا میں نے اُسوقت خدا کو سجدہ کیا کہ جب خدا کی ذات و صفات بھی آشکارا نہ تھیں۔

(۲۵۱) جبتک تو زندہ ہے ایک خار خفتہ ہے جب تو نہ رہیگا تو وہ بیدار ہو جاویگا۔

(۲۵۲) دس فقیر ایک کمبل میں سوتے ہیں مگر دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں رہ سکتے۔

(۲۵۳) کبتک تو گھر سے نقش و نگار سے دل لگائیگا نقش و نگار کو چھوڑ۔ اور گھر سے نکل ربانی کو تلاش کر۔

(۲۵۴) کبتک تو کب تک صورت کا ہی عاشق رہیگا معنی کو ڈھونڈ طالب صاحبت ہو۔

(۲۵۵) صورت تو نے اسکی دیکھی مگر معنی سے غافل ہے۔ اگر عقلمند ہے تو سیپی سے موتی کو نکال ٭

(۲۵۶) تیرا یونس لطنِ ماہی میں پکا ٭ کر دیا تسبیح نے اُسکو رہا

(۲۵۷) گر نہیں اب یاد وہ تسبیح جان ٭ سُن کہ یوں تسبیح میں ہیں مچھلیاں

(۲۳۷) اگر جان بغیر نور خداوندی کے بھی زندہ ہوتی۔ تو پھر کافروں کو لوگ مردہ کیوں کہتے۔

(۲۳۸) جو شخص آفتوں کو صبر سے برداشت نہیں کرتا ہے وہ اُس درگاہ میں مقبول نہیں ہوتا ہے۔

(۲۳۹) اوّلاً انسان کھانے اور سونے میں پھنسا ہوتا ہے۔ مگر آخر الامر فرشتوں سے برتر ہے۔

(۲۴۰) جب دوبارہ انسان جنم لیتا ہے تو اپنے پانوں کے نیچے سب علتوں کو مسل ڈالتا ہے۔

(۲۴۱) تریاق کہتا ہے کہ تو میری پناہ لے۔ کیونکہ میں زہر کی نسبت تجھ سے نزدیک تر ہوں۔

(۲۴۲) جب تلخیوں کی برداشت کرنے کے باعث تیرا دل پر خون ہو جاویگا تو سب تلخیوں سے پھر باہر ہو جاویگا۔

(۲۴۳) اِس طرح پر درگاہِ خداوندی کے ڈھونڈنے والوں کا حال ہے۔ کہ جب خدا آتا ہے ڈھونڈنے والا ناپید ہو جاتا ہے

(۲۴۴) اگرچہ وصل بقا کی بھی بقا ہے۔ لیکن اوّلاً فنا ہو کر ہی بقا ملتی ہے۔

(۲۴۵) سایہ جو نور کی تلاش کرتا ہے۔ جب نور اپنا ظہور کرتا ہے تو وہ معدوم

(۲۷۱) افسوس اُس اندھی گمراہ آنکھ پر ہے جسکو آفتاب بھی ذرہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

(۲۷۲) اے مظلوم آفتاب کیطرف مت دیکھ۔ کیونکہ آسمان کا بادشاہ تیرے زمانہ میں ہے یعنی تیری حیات میں ہی موجود ہے۔

(۲۷۳) اس وجہ سے ہمنے سب ملکوں میں مذاہب کی بنیاد قائم کی تاکہ "یارب" کی صدا آسمان پر پہنچا دے۔

(۲۷۴) اے لوگ اِ حج کیلئے کہاں جاتے ہو کہاں جاتے ہو معشوق اسی جگہ موجود ہے چلے آؤ چلے آؤ

(۲۷۵) معشوق تو اپنا پڑوسی ہی ہے دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے جنگلوں میں ٹکریں مارتے کہاں پھرتے ہو۔ کہاں پھرتے ہو۔

(۲۷۶) جب وہ زندہ ہو گیا تو وہ خود وہی ہے وہ وحدت محض ہے۔ اسمیں دوسری کی شرکت نہیں

(۲۷۷) جب سلطان کے روبرو مقبول ہو کر خوش بیٹھے ہو تو نامہ یا سفارش رسول کی خواہش کرنا جہالت ہے۔

(۲۷۸) ایسے بہت سے آدمی گذرے ہیں جن کی فانی صفات باقی نہیں ہیں

(۲۷۹) انکی تمام صفات حق کی ہی صفات ہیں۔ جو مثل اختر اُس خورشید بے نشان کے سامنے چمکتے ہیں ❊

(۲۸۰) گر ثبوت اسکا تو چاہے تو لکھوں ❊ پڑھ لے قرآں میں لدینا محضرون

(۲۸۱) ہیں جو حاضر نیست وہ ہرگز نہیں ❊ یوں بقائے روح کا کرلے یقیں

(۲۸۲) اے بھائی تو جلد اپنی روح سالکوں کی پاک روح سے متصل کر لے۔

(۲۵۸) بحر دنیا تن ہے ماہی اور روح ÷ ہے نہاں جوں یونس از نور صبوح
(۲۵۹) گر پڑھے تسبیح چھوٹے بیگماں ÷ ورنہ اسمیں منضم ہو کر ہو نہاں
(۲۶۰) آگ ابراہیم پر تھی بے زیاں ÷ ہو جو نمرود اسکو آئے خوف ہاں
(۲۶۱) نفس ہے نمرود عقل و جان خلیل ÷ روح ہے عین او نفس اسکی دلیل
(۲۶۲) کارکن کارخانہ میں نہاں ہوتا ہے تو کارخانہ میں دیکھے تو دکھائی دیگا۔
(۲۶۳) کارکن کے اوپر کام کا پردہ پڑا ہے اسکے باہر اسکو کوئی نہیں دکھا سکتا ہے۔
(۲۶۴) اسکے زمانہ عدل میں ہرن اور چیتے محبت کرنے لگتے ہیں، و لڑائی چھوڑ دیتے ہیں
(۲۶۵) کبوتر کو باز کے چنگل سے امن ملجاتا ہے۔ بکری کو بھیڑیئے سے بھاگنے کی حاجت نہیں رہتی ہے۔
(۲۶۶) کاموں کیوجہ سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گئے۔ جب معنی کو سمجھا۔ مخالفت ختم ہو گئی (راحت ہو گئی)
(۲۶۷) اگر میں وہ حال کہدوں جو میں جانتا ہوں تو لوگوں کے جگر خون ہو جادیں
(۲۶۸) اے پسر تو قرآن کو ظاہری لفظی معنی میں نہ پڑھ شیطان کو آدم میں جسم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔
(۲۶۹) قرآن کا مفہوم مثل انسان کے ہے کہ ظاہر میں تو نقش و نگار (قصہ و کہانیاں) ہیں لیکن اندر جان پوشیدہ ہے۔
(۲۷۰) کہانیوں میں نہر بن کہی گئی ہے لیکن تو (ظاہری) ویرانوں میں خزینہ کی تلاش کر

(۲۹۷) لاکھوں سال اُنکو راستے سے پیچھے پھینکدیا اور اُنکو ادبار کی بد تنگی میں ڈالدیا
(۲۹۸) اِسکی وفصاحت اعمال فلسفہ میں ملیگی تو اُسکو معمولی گفتگو میں نہیں سمجھ پاویگا۔
(۲۹۹) کون سے بند سے تجھے رہائی حاصل کرنی ہے کونسی قید سے نکلنا ہے۔
(۳۰۰) بند تقدیر و قضا مخفی شے ہے کہ اُنکو کوئی برگزیدہ شخص ہی سمجھ سکتا ہے
(۳۰۱) اگرچہ وہ امکان میں نہیں ہیں وہ زندان اور بند آہن سے بدتر ہیں۔
(۳۰۲) کیونکہ آہن کے بند کو آہنگر توڑ سکتا ہے زندان کی اینٹیں مزدور کھود سکتا ہے
(۳۰۳) یہ خفیہ اور بھاری بند عجیب ہیں جنکے سامنے لوہار بھی عاجز ہیں۔
(۳۰۴) غذا سے وہ اجزا جذب کرتا ہے اور اپنے جسم کا تانا بانا تنتا ہے
(۳۰۵) لیکن فوت ہونیکے باعث غمگین نہ ہونا چاہیئے کیونکہ جو پرانا ہو گیا وہ نیا بن جائیگا
(۳۰۶) چونکہ ایمان حاصل ہو گیا ہے اسلئے زندہ ہی ہے چونکہ با ایمان مرتا ہے اسلئے پائندہ قائم
(۳۰۷) پہلے جمادات کی اقلیم میں آیا۔ جمادات سے نباتات میں پیدا ہوا
(۳۰۸) برسوں نباتات میں بسر کی۔ جمادی حالت کی کوئی بات یاد نہ رہی۔
(۳۰۹) جب نباتات میں سے حیوانات میں پہنچا تو کوئی بات بھی نباتات کی اقلیم
کی یاد نہیں رہی۔
(۳۱۰) آیا پھر حیوان سے انسان میں ✤ دیں اُسے خالق نے اتنی قلبتیں
(۳۱۱) اِس طرح وہ ہر ولایت میں پھرا ✤ اور اب دانا و عاقل ہو گیا
(۳۱۲) اے یوسفوں کے پوستین کو پھاڑنے والے جب تو اس خواب گراں سے

(۲۸۳) اُنکی خاکپا سے اپنی بینائی کو روشن کر لے - اگر تو ہردم کے سونے اور اُٹھنے (مرنے جینے) سے بچنا چاہتا ہے -
(۲۸۴) اُنکے پانوں کی دھول کا سرمہ بنا تاکہ تو نفس بدمعاش کا سر کچل سکے
(۲۸۵) نفس کے اس طلسم کو جو تیرے اندر ہی توڑ ڈال خزانۂ پیر کامل کو نقب لگا کر دستیاب کر
(۲۸۶/۲۸۷) شکر کر اور شاکروں کا بندہ ہو جا اُنکے سامنے مردہ بن کر امر بن جا -
(۲۸۸) جنکی نظر کے پڑنے سے خاک بھی اکسیر بنجاتی ہے وہ اپنی آنکھ کا ایک گوشہ ہماری طرف بھی کریں -
(۲۸۹) جنکی اس تن کے پہلے عمریں گذر گئی ہیں کھیتی کے پہلے پھل کھائے ہیں -
(۲۹۰) سبزہ کیطرح بار ہا پیدا ہوا ہوں سات سو ستر قالبوں میں مجتسم ہو چکا ہوں -
(۲۹۱) معدنیات میں سے مرکر نباتات ہوا وہاں سے نکلکر جانوروں میں پیدا ہوا -
(۲۹۲) حیوانات میں سے گذر کر انسان بنا پس مجھے اسبات کا کیا خوف ہو سکتا ہے کہ مرنے سے میں کم ہو جاؤں گا -
(۲۹۳) دیگر حملہ میں انسانی جامہ سے فرشتوں میں پیدا ہو سکوں گا -
(۲۹۴) پھر فرشتوں میں سے بھی اگر پرواز کروں تو وہ ہو جاؤں جو وہم گمان سے بھی باہر ہے
(۲۹۵) پھر عدم ہو جاؤں وہ جوں ارغنوں ٭ گوں کہے انا الیہ راجعون -
یعنی اُنکی ذات کے سوا سب چیز فنا ہونیوالی ہیں -
(۲۹۶) جن رہروؤں کو ابلیس نے ورغلایا اُنکی گمراہی کا حال مجھ سے سُنو

غلطی نامہ

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۲	دوسری	نیچے سے	۹۸	۹۹
۴	پہلی	نیچے سے	تتمہ۔ ترجمہ فارسی اشعار ۱۱۱	تتمہ ۱۰۸ ترجمہ فارسی اشعار ۱۱۵
۱۸	پہلی	اوپر سے	کہ یہ کوئی	کہ کوئی
۱۸	تیسری	//	واقف نہ ہوگا	واقف ہوگا
۲۶	//	نیچے سے	توکم بختی	توکہ بختی
۲۹	آٹھویں	اوپر سے	وحدت	ہستی
//	نویں	//	معمولی	معمولاً
۲۹	ساتویں	نیچے سے	یالور	مالور
//	//	//	یاآب	ماآب
۳۳	پانچویں	اوپر سے	لبستان	نسیان
۳۸	آٹھویں	//	عقل و عقل و جان و جاں	عقلِ عقل و جانِ جاں
//	چھٹی	نیچے سے	میدارو	میدزرو۔

جاگے گا تو بھیڑیا بن جائے گا۔

(۳۱۳) ہوش کے لوٹنے والا خالی نشہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ خواہشات بھی ہیں جو آنکھوں اور کانوں کو بند کر دیتی ہیں ❊

(۳۱۴) اگر باہوش رہنا چاہتا ہے تو ترکِ خواہشات کر۔ کیونکہ خواہش بار بار چشم و گوش کو بند کر دیتی ہے۔

(۳۱۵) اگر تن میں دل منوّر نہ ہو تو اسکو زیر زمین دفن کردو کیونکہ شبستان میں خالی فانوس کی عزت نہیں ہوتی ہے۔

(۳۱۶) اللہ اکبر کہہ اور اس شوم (نفس) کا سر کاٹ ڈال تاکہ تو رنج سے رہائی پائے۔

(۳۱۷) تکبیر کے معنی یہی تو ہیں ای خوش وضع۔ کہ اے خدا میں تیرے سامنے قربان ہوتا ہوں۔

(۳۱۸) قربانی کرنے کے وقت اللہ اکبر کہہ کر نفس مردود کو ذبح کرنا چاہیئے۔

(۳۱۹) روح عالم بالا کی طرف آرہی ہے۔ آب و گلِ کا میلان دوزخ پہنچاتا ہے۔

نوٹ - ان اشعار کے ترجمہ میں بڑی مدد "الہام منظوم" سے ملی ہے۔ بلکہ بعض بعض جگہ تو ہمنے اس کے مضمون کی لفظ بلفظ نقل ہی کر دی ہے۔ جو ترجمہ نظم میں ہے وہ سب الہام منظوم کا ہی ہے ❊

(مصنف)

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۵۸	پہلی	اوپر سے	ننگ	سنگِ
"	تیسری	نیچے سے	ہی	بہی
"	پہلی	"	طمع	طبع
۶۰	چھٹی	اوپر سے	اسے	سے
"	ساتویں	نیچے سے	بھی	کبھی
۶۱	چھٹی	اُوپر سے	جلوہ گزبجز	جلوہ گاہِ
۶۴	پانچویں	"	درویشی	روشن ضمیری
۶۷	دوسری	"	اُس میں	اُس سے
"	چھٹی	"	این درگو ما درگہِ نو میدنمی ست	آئین درگاہِ ما درگاہے نا امیدی نیست
۶۸	ساتویں	نیچے سے	دلی	دل
۶۹	چوتھی	"	خرچہ	فرحہ
۷۰	نویں	"	جیسے	چونکہ
"	پہلی	"	خدا سے واصل ہو گئے ہیں	خدا ہو گئے ہیں
۷۱	چوتھی	اوپر سے	تو وہ تصور بتین طرح سے ہوتا ہے	تو تصور یعنی دھیان کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ تصور تین طرح سے ہوتا ہے۔
۷۴	پہلی	"	غنیہا	خنبہا
"	"	"	دینہا	دنبہا

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۳۸	چوتھی	نیچے سے	قصر	قعر
۳۹	پہلی	اُوپر سے	بدۂ	نُثار
۴۴	چوتھی	نیچے سے	ایں جہانے ہست	ایں جہانے غنیمت
۴۵	نویں	″	سیارہ	ستارے
۴۶	پانچویں	اوپر سے	بدار	مدار
″	دوسری	نیچے سے	نکالنا ہوگا	نکالنے ہونگے
۴۸	تیسری	اوپر سے	نار دوزخ	نہر شہوت
″	آٹھویں	نیچے سے	تو	نو
۴۹	آخری	″	گروقت گزرد	گررفت گورد
۵۰	ساتویں	نیچے سے	اور	ایک اور
۵۱	دوسری	″	رخت	زفت
″	پہلی	″	یکزین	یک تن
۵۳	آٹھویں	اُوپر سے	سرّ	سیر
۵۴	پانچویں	″	خر	حُر
۵۵	پہلی	″	آنجان	ایجان
″	نویں	نیچے سے	بوسر لب ہائے	بوسۂ لبِ لعل
″	چھٹی	″	سنگدکی	سنگدلی
۵۷	پہلی	اُوپر سے	یا قلب	قلب

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۸۴	پہلی	اوپر سے	ازوے	زوتہ
〃	آٹھویں	نیچے سے	شفیق	مفیق
〃	چوتھی	〃	میں	بھی
۸۶	ساتویں	〃	قال	حال
〃	چوتھی	〃	غیر	دیو
۸۷	ساتویں	〃	ہمسائیہ	ہمسایہ نو
〃	پہلی	〃	جیل	جہل
۸۹	پہلی	〃	فرض	فرضی
۹۴	آٹھویں	اوپر سے	خان صاحب	خواجہ خان صاحب
۹۵	دوسری	〃	اویار	ادبار
〃	آٹھویں	〃	جافد	بافد
〃	ساتویں	نیچے سے	پھل	مَیل
۹۹	چھٹی	〃	شخص	شخص جو
۱۰۰	چوتھی	اوپر سے	اسیراستت	اسیر ست و
۱۰۶	پانچویں	نیچے سے	قربانی گاؤ	قربانی کی گاؤ
۱۰۷	آٹھویں	〃	براسفلین	دراسلفین
۱۰۸	ساتویں	اوپر سے	حوصلہ	صلہ
〃	درمیان دسویں و گیارہویں	〃		دو حرفی تمتہ (نئے باب کی سرخی)

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۷۴	دسویں	اوپر سے	زنگ	زنگ
۷۵	چوتھی	"	خود جوسپہر	جودسپہر
۷۶	چھٹی	نیچے سے	ہدبون	جزبون
"	چوتھی	"	حالی پرست	اے حالی پرست
۷۷	تیسری	"	ہیں کا	ان کا
"	پہلی	"	حضرت	عصر
۷۸	چھٹی	"	روح کو	روح
۸۰	پہلی	اوپر سے	گلیمے در	در گلیمے
"	"	نیچے سے	اور جہالت گذشتہ زمانے میں استقرار قوت	اور جاہل لوگوں کی قوت گذشتہ زمانہ میں اسقدر
۸۱	پہلی	اوپر سے	ضرور پکڑ گئی	زور پکڑ گئی
"	"	"	درویش اور فلاسفروں	درویشوں اور فلاسفران
"	چھٹی	"	اشعاروں	استعاروں
"	آٹھویں	"	ہے	تھی
"	"	"	اتنی عمدگی	اتنی ہی عمدگی
"	بارہویں	"	یانقش	بانقش
۸۲	دوسری	اوپر سے	گوئی	گوسے
۸۳	پہلی	نیچے سے	شفیق	سفیق

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۱۳۲	تیسری	نیچے سے	خود	نور
۱۳۵	"	اوپر سے	جلوہ گر	جلوہ گاہ
"	نویں	"	توبہ کے	توبہ کو
۱۳۶	ساتویں	"	تیری ہی بُری عادت ہے بت مرتبہ اُسکے کانٹے	تیری ہر ایک بُری عادت کے کانٹے بہت مرتبہ۔
۱۴۰	چھٹی	"	دکھا سکتا	دیکھ سکتا
"	آٹھویں	نیچے سے	کاموں	ناموں
"	پہلی	"	نہر بن کہی گئی ہے	نہر لبن کہی گئی ہیں۔
۱۴۳	تیسری	"	ختیں	خبیثیں

نوٹ۔ کاتب نے کہیں کہیں فارسی اشعار پر نمبر نہیں ڈالے ہیں۔ ناظرین کو خود ہی اِس کمی کو پورا کرنا ہوگا۔

مصنف

صفحہ	سطر	کہاں سے	غلط	صحیح
۱۰۸	دوسری	نیچے سے	آور	اور
۱۰۹	نویں	"	کیا ہے	لکھا ہے
۱۱۱	تیسری	"	کام	نام
۱۱۳	دوسری	اوپر سے	جرش	جوش
"	پہلی	نیچے سے	ذفات	ذوات
۱۱۵	"	"	میں	سے
۱۱۶	آٹھویں	اُوپر سے	عشق سے تو ریزہ ریزہ جسم کر	عشق سے پھر ریزہ ریزہ جمع کر
۱۱۷	ساتویں	نیچے سے	عرش کے لامحدود نور میں وہ مثل ذرّہ کے نظر آتا ہے	عرش اُسکے بے حد و وافر نور میں مثل ذرّہ کے نظر آتا ہے۔
۱۲۱	نویں	اُوپر سے	کہنے سے نہیں ملتا ہے	کہنے میں نہیں آتا ہے۔
۱۲۳	دوسری	"	میرا دل	تیرا دل
۱۲۶	تیسری	"	موجود	غالب
۱۲۷	پہلی	نیچے سے	اور	اُن
۱۲۸	"	اُوپر سے	واقف کار لوگ	واقف کاران منزل
"	"	نیچے سے	(۹۴۲	(۱۴۲)
۱۳۱	چوتھی	اوپر سے	نفس	سموم نفس
"	"	"	بھی کرتا ہے	بھی تو کرتا ہے
"	آٹھویں	"	مردوں کو بھی	مردون کو